غازی علم الدین شہید

مصنف

رائے محمد کمال

ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور

تحفہ از
جناب پروفیسر مظفر محمود خان

غازی علم الدین شہید علیہ الرحمۃ

آغوشِ مادر سے — حلقۂ تراب تک

مصنفہ
رائے محمد کمال

ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور

قیمت ۳۰ روپے

عظیم ماؤں کے نام

جنہوں نے

غازیوں ——————

اور

شہیدوں —————— کو جنم دے

اور جب بھی دین و ملت کو ضرورت پڑی اپنے بیٹوں

کو پھولوں کے ہار پہنا کر سوئے مقتل روانہ کیا۔

فصلِ گریہ

ہندوؤں نے رام چندؑ اور کرشن کو اوتار کا درجہ دے رکھا ہے یہودی حضرت عزیرؑ کو خدا کا پرتو سمجھ بیٹھے۔ عیسائی حلول کے نظریے کو اپنا کر تثلیث کے قائل ہو گئے۔

مگر بعض نافہم اور باطل شناس مسلمان ہیں کہ سیدالبشرؐ کی تعظیم کو کفر قرار دیکر ابدی ذلتوں کو پوری قوم کا مقدر بنا رکھا ہے۔ اس لیے کہ ملتِ اسلامیہ کے سینوں میں عشقِ رسولؐ کی چنگاری فروزاں رہے تو زندگی کی علامت، اگر بجھ جائے تو موت کا ثبوت ہے۔

تعارف

(۱)

شہباز طالع مند جو طالع آزمائی کے لیے کوچۂ سرفروشاں کی منڈیر سے پرفشاں ہو کر اٹھا، اڑا جھپٹا، مردودِ رسالت پناہ کا شکار کرتا ہوا لوٹا۔ دربارِ دُرِ یتیم کی چوکھٹ چومی اور شاخِ طوبیٰ پر جا بیٹھا۔ یہی غازی علم الدین شہید ہے۔

(۲)

غازی ممدوح رح نے گستاخِ مصطفےٰ کا خاتمہ کیا اور جوان سال مصنف ــــــــ نے ان واقعات و واردات کو اپنے مخصوص انداز میں جامۂ تحریر پہنایا ہے۔ راقم مذکور روحانی اعتبار سے تو کسی صورت بھی علم الدین شہید کے ہم مرتبہ نہیں۔ لیکن بلحاظ سن و عمر انکے سے ہیں۔ یہ حسنِ اتفاق اس امر کی روشن دلیل ہے کہ عشقِ رسول کی چنگاریاں ہمیشہ سے مسلم دلوں کا اثاثہ ہیں۔ جو کبھی سرد نہیں پڑ سکتیں اور طرزِ نگارش کی یہ ادا کسی صاحبِ کمال ہی کو جچتی ہے۔

حافظ مقبول احمد

دیباچہ (جس کی آرزو ہی رہی)

● ـــ صاحبزادہ غلام نصیر الدین نصیرؔ

● ـــ چوہدری رفیق احمد باجوہ

کتاب کوئی بھی ہو، کسی دیباچے کی محتاج نہیں ہوتی۔ درحقیقت کسی معروف شخصیت سے رائے لکھوانے کی خواہش، مفت تشہیر کا بہانہ ہے۔ میں بھی اس سے بری الذمہ نہیں۔ میری نگاہِ انتخاب صاحبِ دل ہستی، ایک عظیم شاعر "آغوشِ حیرت" کے خالق صاحبزادہ غلام نصیر الدین نصیرؔ صاحب مدظلہ پر پڑی۔ میں نے اس سلسلے میں بڑوں کے مقام کا لحاظ رکھتے ہوئے تین خط ارسال کیے۔ مگر جواب ندارد۔ اسے میری کم نظری پر محمول کریں کہ ایک گمنام عقیدت مند، مسندِ ارشاد پر متمکن شہزادے سے لو لگائے بیٹھا رہا۔

پیر صاحب کی مسلسل اور مکمل خاموشی سے گھبرا کر میں نے ایڈووکیٹ رفیق احمد باجوہ کی طرف رُخ کیا اور دفتر میں ان سے مقررہ وقت پر مدعا بیان کیا۔ وُہ مسودہ دیکھتے ہی فرمانے لگے "میں اتنا وقت کہاں سے نکالوں گا" خیر بہتے ہوئے پانی پہ بنیادِ مکاں رکھی گئی۔ حسبِ پروگرام مجھے تین چار دفعہ باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ مگر رفیقِ ملت مصروف تھے۔ یہ کہنا تو صحیح نہیں ہوگا کہ وُہ ـــــ گریزاں رہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ میں بھی اسی مصروف ملت کا ایک فرد ہوں اور میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ غیر معینہ ثنا میں اس ـــــ کے نام کردوں۔

راقم الحروف دیباچہ نہیں لکھوا سکا۔ چونکہ پیشہ وارانہ فن سے قطعاً ناآشنا ہوں۔ میں اس مروجہ رسم کے خلاف بغاوت کی بنا پر آئندہ کے لیے بھی اپنے کرم فرماؤں سے معذرت چاہتا ہوں

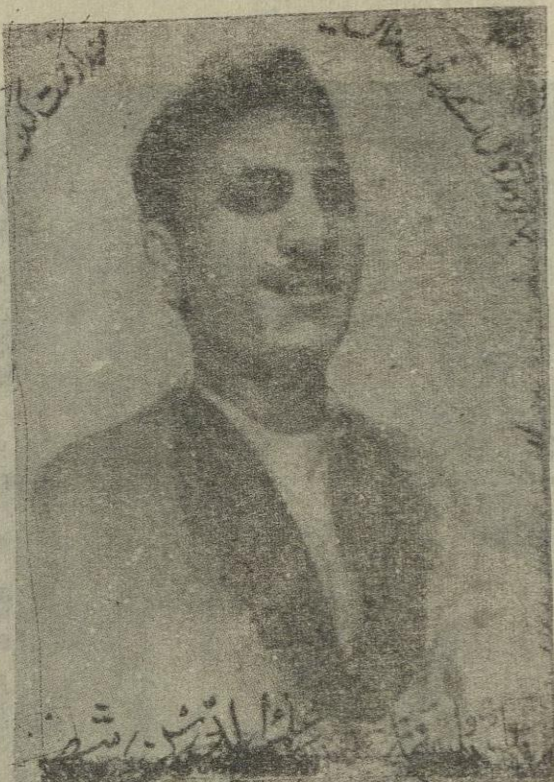
ہائے میں کیا سمجھا تھا ـــــ وہ کیا نکلا؟

مصنّف

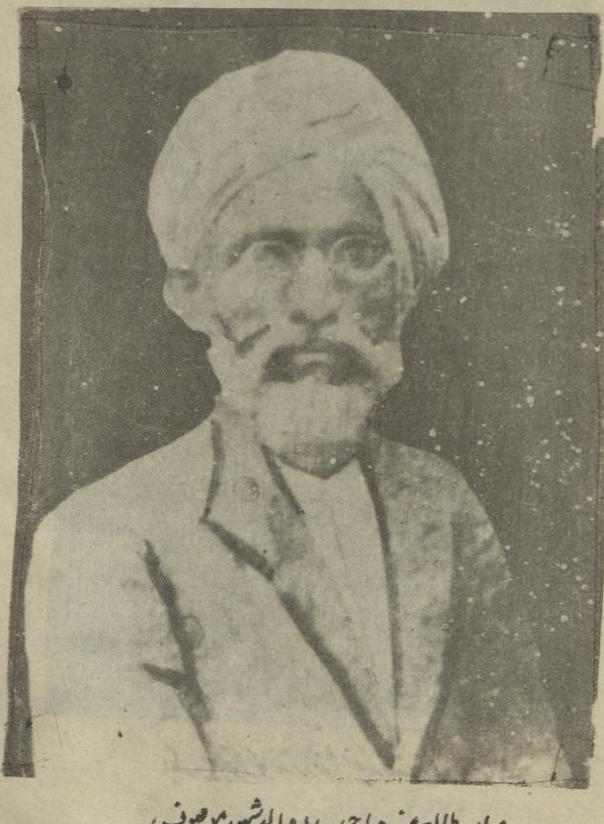
آئینہ



شہید موصوف
(یہ فوٹو پہلی بار "زمیندار" میں شائع ہوا)



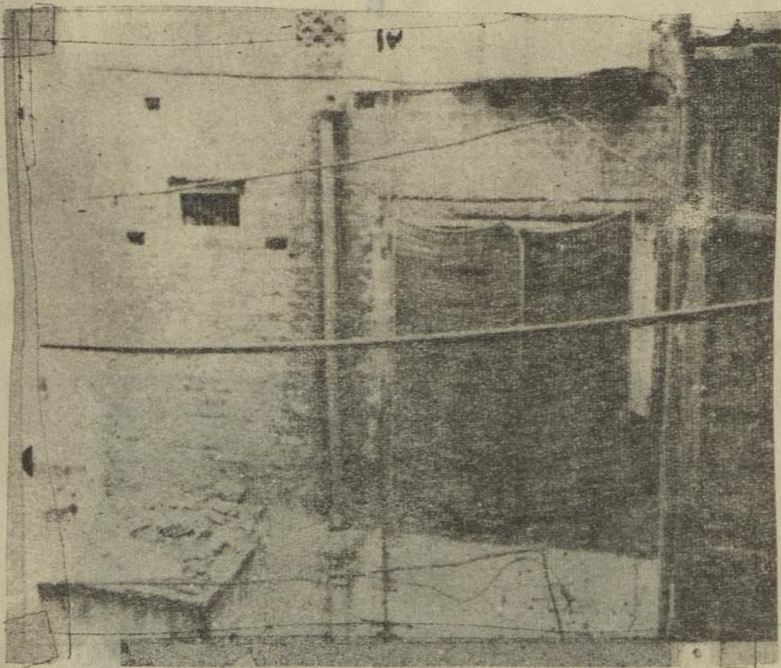
ایک مصور کا نذرانۂ عقیدت



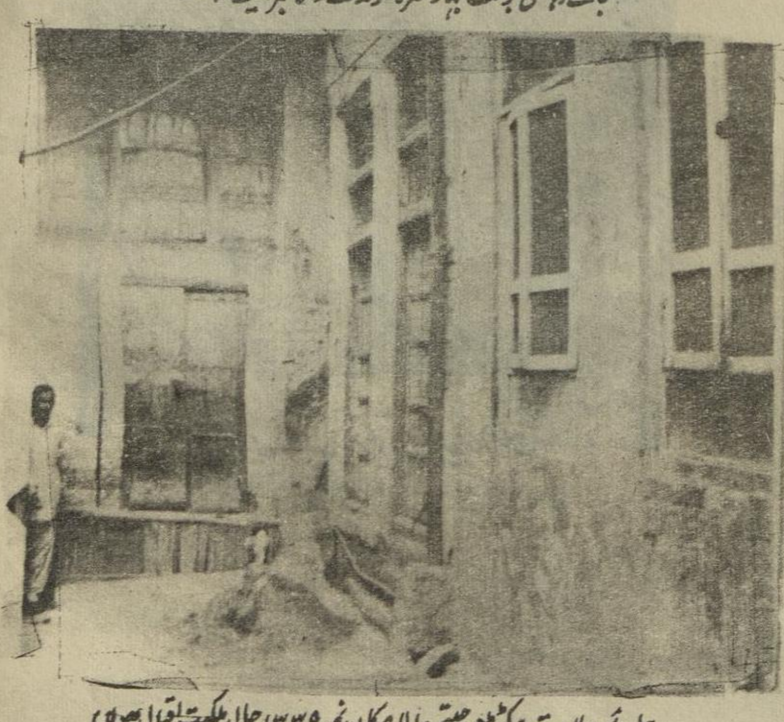
میاں طالع مند صاحب (والد شہید موصوف)



میاں محمد دین صاحب (برادرِ اکبر شہیدِ رسالت)



جائے رہائش بوقت جہاد کٹڑہ سوندھے والا نمبر الف ۵۸۴



جائے ولادت (کٹڑہ چیتے والا مکان نمبر ۱۳۳۹ حال ملکیت اقبال ہوڈا)



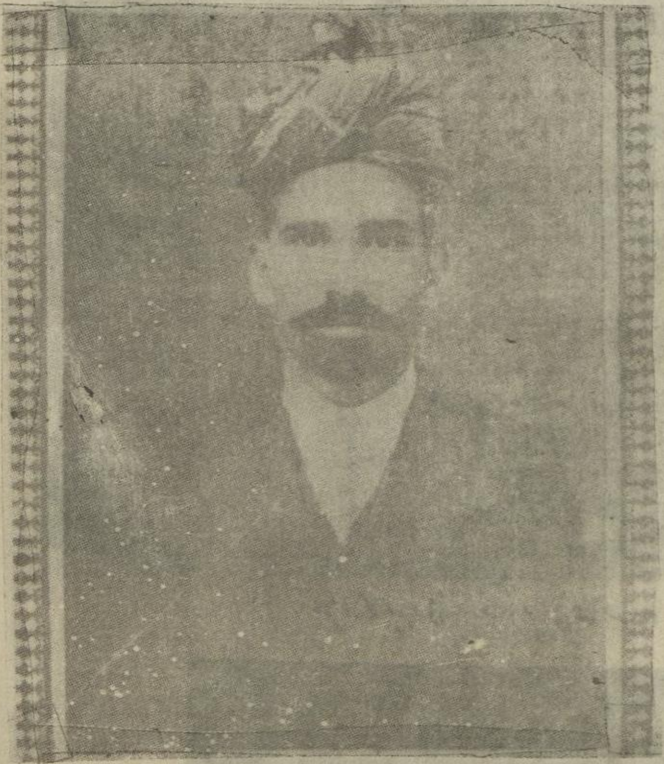
دکان راجپال جہاں واقعۂ قتل پیش آیا



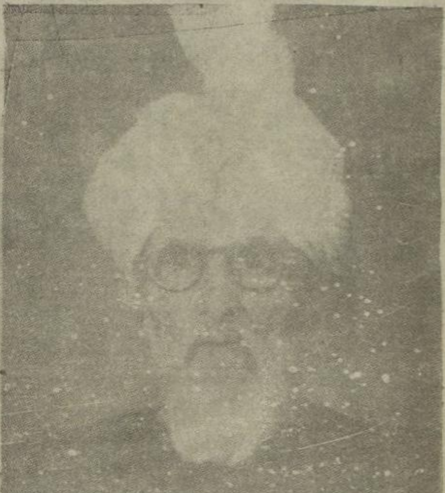
پہلا قافلہ (جن فدا کاران اسلام کی ہمت مردانہ شہید مرحوم کا لاشہ لینے میں کامیاب ہوئی)



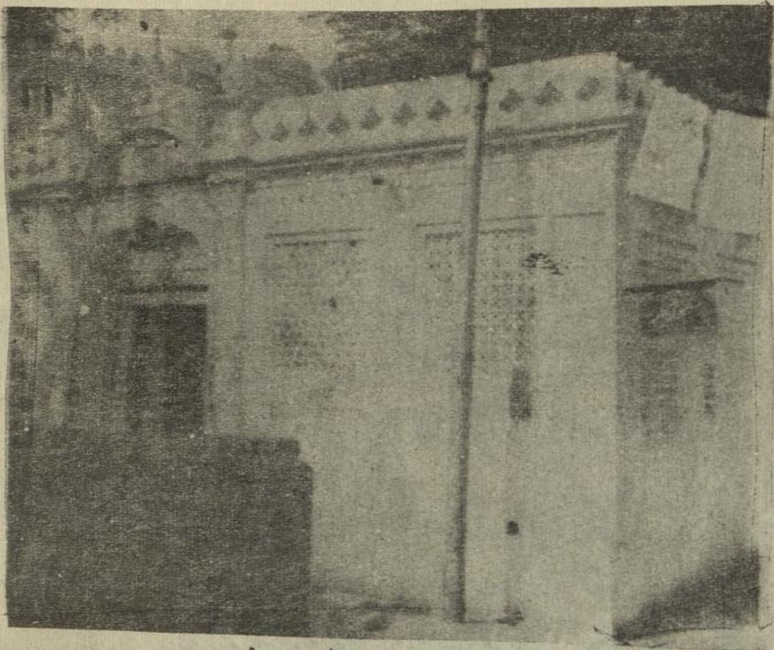
رضاکاروں کا دوسرا قافلہ۔ (برکت علی، تاج الدین، عبدالغنی، محمد رمضان، غلام محمد، محمد شفیع، غلام محمد
فضل دین، نواب دین، محمد دین، محمد شریف، عبداللہ، محمد رمضان، غلام مصطفےٰ، مہر دین
اللہ دتہ، غلام قادر، گلزار محمد، محمد رفیق، وزیر علی، غلام محمد خادم، سید عنایت شاہ، ملک لال دین
قیصر، شیخ غلام مصطفےٰ احیرت، امیر پہلوان، کرامت بیگ، الطاف حسین، صادق محمد، نور الٰہی)



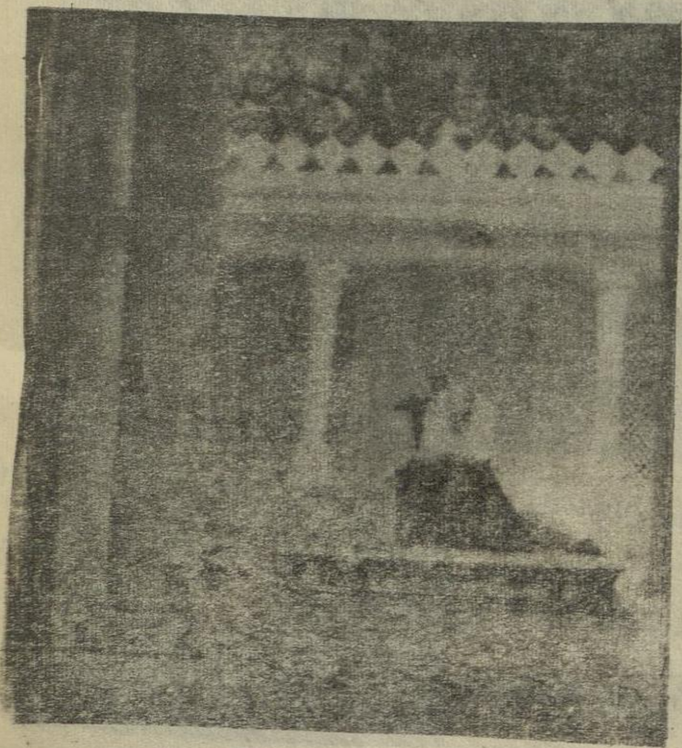
سید حبیب شاہ (مالک و ایڈیٹر روزنامہ "سیاست")



خان محمد اکبر خان (رئیسِ اعظم میاں والی)



مزار کا بیرونی منظر (میانی صاحب)



اندرونی
منظر

کربِ تخلیق (مقدمہ)

- گفتگوئے چشم۔
- احساسِ تنہائی۔
- تاریخ کی گم گشتہ کڑیاں

○

وہ کیا سمجھے وہ کیا جانے، کیا ہے آبلہ پائی
جس کے راستے میں کوئی ویرانہ نہیں آتا

راز تمنا صرف یہ ہے کوئی ہم زباں ملے جو گفتگوئے چشم سمجھ سکے۔ اگر کوئی رازداں مل گیا تو شوخیٔ قسمت! ورنہ احساسِ تنہائی کا داغ لیے اپنے سائے کو دیکھتا ہوا کسی صحرا کی سمت نکل جاؤں گا۔

——میری تنہائیوں کا راز ہے۔ یہ راز صرف ان لوگوں پہ کھلتا ہے جو جگر کاوی کو عبادت سمجھتے ہیں دن کے وقت ان کی آنکھیں بنجر سی دکھائی دیتی ہیں اور رات کے سائے میں یہاں رتجگوں کی فصل لہلہا اٹھتی ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک غیر مرئی لذت ہے جس کا اثر محسوس تو کیا جا سکتا ہے۔ بیان نہیں اوراق کی تکمیل کربِ تخلیق کا حاصل ہے۔ جسکی زندگی کیلئے روحِ فکر، خونِ جگر کے قطروں میں منتقل کر کے براہِ نوکِ قلم سینۂ قرطاس کی نذر کرنا پڑتی ہے۔ مجھے یہ دعویٰ تو نہیں کہ میرے اندازِ نگارش نے فن کی بالائی حدوں کو چھوا ہے۔ مگر یہ فخر ضرور ہے کہ میں نے لفظوں کا کھیل اس اُمید پہ رچایا ہے شاید روح کی گہرائیوں میں ہل چل مچ جائے۔

رازِ تمنا صرف یہ ہے کوئی ہم زبان ملے جو گفتگوئے چشم سمجھ سکے۔ اگر کوئی رازداں مل گیا تو خوش قسمتی ورنہ احساسِ تنہائی کا داغ لیے اپنے سائے کو دیکھتا ہوا کسی صحرا کی سمت نکل جاؤں گا۔

؎ احتیاطاً دیکھتا چل اپنے سائے کی طرف
اس طرح شاید تجھے احساسِ تنہائی نہ ہو

کسی بھی تذکرہ نگار کی یہ ایک غیر معمولی خوبی ہوتی ہے کہ وہ تاریخ کے تاریک مندر میں گھنٹیاں بجانے والوں کا چہرہ کردار اپنے الفاظ کے چراغوں کی روشنی میں دکھا سکے۔ ویسے یہ مرحلہ انتہائی کرب انگیز ہے۔ تاریخ کے آئینے پر گردشِ ایام کی دھندلاہٹ ایک مدت سے گھونسلا بنائے بیٹھی ہے اور وقت کا تقاضا ہے کہ بڑی احتیاط سے یہ دھول اتار دی جائے۔ مجھے تو اس صحرا کی خاک چھاننا ہی ہے۔ اگر آپ بھی دو چار قدم تکلیف گوارا کریں تو شاید اتنی دیر مجھے احساسِ تنہائی نہ ہو۔

؎ چلو تم بھی سفر اچھا رہے گا
ذرا اجڑے دیاروں تک چلیں گے

ابھی دو ورق الٹنے کے بعد تخیلات نصف صدی ماضی کے روٹھے ہوئے لمحات کو منا رہے ہوں گے۔ گویا آپ کی ذرا سی جنبش سے برسوں کے حقائق بے نقاب ہونے کے لیے مضطرب ہیں۔ مگر میں نے گرد و غبار کے کفن میں اٹے ہوئے جاں بلب اوراق کو کس جاں فشانی سے زندگی عطا کی؟ ان خوابیدہ لمحات کو صدائے قلم سے کس طرح جگایا؟ اور گردشِ حالات میں دربدر بھٹکنے والے حقائق کو کہاں کہاں سے ڈھونڈا؟ مجھے ڈر ہے کہ آپ میری دیوانگی کے افسانے سن کر شہد کی صورت

پگھلنے لگیں گے یا گھبرا کے پتھر ہو جائیں گے۔ میرا صحرانوردی کا پہلا موقع تھا اور منزلِ شوق کوسوں دُور احساس کے انگاروں کی راکھ شبانہ روز روح کے رِستے ہوتے زخموں پر چھڑکی۔ تب کہیں مالا کے برسوں سے بکھرے ہوئے موتی یکجا کر سکا۔

میں خوش ہوں۔ یہ ٹھوکریں تو میری متاعِ حیات ہیں۔ اس لئے کہ یہ کارِ خیر، لیٖہ معاشی نہیں، انشاء اللہ العزیز وسیلۂ نجات بن سکے گا۔ ویسے بھی "میرا سکون یہی ہے کہ میں بے سکون رہوں"۔

میں نے حتی الوسع تاریخ کی کڑیوں کو مربوط رکھا ہے اور عام قارئین کی دلچسپی کا لحاظ بھی۔ آپ شاید میری ان داخلی و خارجی کیفیات کا کھوج نہ لگا سکیں۔ تاریخ کے اوراق کے حوالے سے اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس صدی کے ربعِ اوّل میں حالات کے ماتھے پر بڑی واضح شکن نمودار ہوئی۔ ان نازک مرحلوں کی وہ حسرت بھری داستان، جب پورے برصغیر خصوصاً لاہور کے گلی کوچوں میں رسولِ عربیؐ کا تقدس لہو لہو تھا۔ بے بس و بیکس مسلمان بڑی بے بسی و بیکسی سے ایک دوسرے کا منہ تکا کرتے۔ اس وقت آریہ سماجیوں کی نشتر زنی سے عوام ہی نہیں، خواص بھی تڑپے

۱۲ اگست ۱۹۲۷ء کو دہلی میں مولانا محمد علی جوہرؒ نے "ہندوستان ٹائمز" کے نمائندہ سے صوبہ سرحد میں تنازعۂ ہندو مسلم کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اپنے جذبات کا یوں اظہار کیا۔ اگر راجپال ہائی کورٹ سے بری ہونے کے بعد معذرت شائع نہ کرتا" یعنی اس کتاب کو چھاپنے کا وُہ دوبارہ مرتکب ہوتا "تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتا"۔ مگر وقت آنے پر نصیب جاگے بھی تو کس کے؟ لاہور کا ایک غیر معروف اور گمنام لڑکا آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکا۔ مجاہدِ ہندی ایسی سنجیدہ شخصیت کے تاریخی بیان سے ہی اس واقعے کی نزاکت کا احساس ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس کہ کسی دشمن یا دوست مؤرخ نے تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کو کتابی صورت میں مرتب کیا اور نہ کوئی فراخدلی سے اس کا تذکرہ قلمبند کر سکا۔ اگر کسی نے کبھی تھوڑا بہت لکھا بھی تو وُہ انقلابِ دوراں سے محفوظ نہیں رہ سکا۔

جس سے مورخین نے بے اعتنائی برتی۔ اہلِ قلم ہمیشہ چشم پوشی کرتے رہے اور تا حال سرکاری سطح پر بھی سرد مہری کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے (پچھلے دنوں لاہور ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس مسٹر جاوید اقبال نے مقدمے کی فائل عجائب گھر میں رکھنے کا حکم دیا تھا) تو اس واقعے کو ضبطِ تحریر میں لانا کتنا کٹھن مرحلہ ہے۔ پھر کوئی ایک دو سال کی بات نہیں اور نہ پانچ دس سال کا عرصہ۔ بلکہ نصف صدی سے

بھی زائد وقت گزر چکا ہے ۔اب پہلے تو ایسا شخص موجود ہی نہیں جو حافظے کی قبروں کو کرید سکے۔ اگر کوئی ہے بھی تو وہ اس متعلق کچھ نہیں جانتا اور نہ اپنے پاس دستاویزی ثبوت رکھتا ہے ان باتوں کے پیش نظر بڑی آسانی سے سوچا جاسکتا ہے کہ مجھے کس کس دروازے کو کھٹکھٹانا پڑا ۔حصول مقصد کی خاطر میں ان لوگوں کے پاس بھی گیا ۔جنھوں نے میرا تمسخر اڑایا ۔بعض جگہ تو عزت نفس بری طرح مجروح ہوئی ہے

یں تے کاغذ پہ سجائے ہیں جو تابوت نہ کھول

لفظ جی اٹھے تو تو خوف سے مرجائے گا

راقم الحروف اس طنزیہ رویے کا مستحق کیوں ٹھہرا ؟ میرے خیال میں عموماً فرقہ ورانہ اثر کار فرما تھا ۔شاید اس کا سبب میری کم عمری بھی ہو ۔میں اس سلسلے میں مذکورہ بالا گروہ سے ہی ملاقی نہیں ہوا بعض جگہ مجھے چشم ماروشن ، دلِ ماشاد کے گلدستے بھی پیش کیے گئے ۔ایک جگہ حوصلہ شکنی کی سعی کی گئی تو دوسری جانب حوصلہ افزائی نے بڑھ کر مجھے سہارا دیا ۔چار ماہ متواتر لائبریریوں کے چکر لگانے پڑے اور قریباً اتنے ہی دن مختلف دروازے کھٹکھٹانے میں گزرے ۔

غازی علم الدین شہید کے قریبی دوست میاں نیاز احمد سمن آباد میں رہائش رکھتے ہیں جبکہ شہید موصوف کے لواحقین محلہ چابکسواراں میں ۔ہر دو جانب میرا باقاعدہ رابطہ رہا ۔طویل انتظار کے باوجود میاں صاحب سے حسبِ توقع معلومات تو نہ مل سکیں ۔مگر جو کچھ میسر ہوا وہ بھی غنیمت ہے ۔

غازی صاحب کے حقیقی بھتیجے شیخ رشید احمد صاحب سے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا ۔بعض نشستیں تو نہایت طویل تھیں ۔میں جمعے کے روز اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا اس کے باوجود مجھے مہینوں انتظار کرنا پڑا اس کی وجہ تو معلوم نہیں ہوسکی ۔ان کا رویہ مشفقانہ مگر لہجہ نہایت محتاط تھا ۔ میں ہر بار وعدے کے مطابق کوچہ چابکسواراں پہنچا لیکن وہ گھر پر موجود نہ ہوتے اور کبھی کسی سرکاری دورے کی تیاریوں میں مصروف پائے جاتے ایک دو دفعہ ان کی طبیعت ناساز تھی ۔بنابریں دیگر مسائل کا سامنا تھا ۔کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ کئی اوقات کے باعث خاندانی دستاویزات کو نہ کھنگال سکے ۔بے وفا لوگوں کے قصے سنانے کے بعد صبح آنے کو کہتے اور کبھی کل شام کو ۔اس لیے اپنے گاؤں سے پہنچتا اور کبھی مجھے ہفتوں لاہور میں ہی ٹھہرنا پڑتا ۔بعد میں متعدد بار گوجرانوالہ سے بھی آنا پڑا ۔بہرحال میں ان کا ممنون احسان ہوں ۔انہوں نے کتاب کی تکمیل اور تصویروں کی تلاش میں میری ہر ممکن رہنمائی فرمائی ہے۔

لیکن میں ہر جائی الفاظ میں اس کا رسمی تذکرہ کر کے احسانات کی قدر و قیمت گھٹانا نہیں چاہتا کیونکہ بعد ازاں جب انکی ذمہ داریوں کا علم ہوا تو وہ واقعی مجبور تھے اور ان کے روز و شب انتہائی مصروف تھے اسلیئے مجھے اپنی جلد بازی کا شدت سے احساس ہوا اور ان کی نوازشوں کا شمار کر کے عرقِ انفعال میں بھیگ گیا شہید موصوف کے خاندان میں سے اقبال عرف بھولا (چھتریاں والا) نے ہر بار بسم اللہ کے ساتھ خوش آمدید اور ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ الوداع کہا۔ ان کے لختِ جگر شفا ہر خانہ منزل بھی میرے انتظار میں اکثر چشم براہ ہوتے۔ میانوالی قیام کے دوران میزبان میرے ایک پرانے دوست رائے اخلاق احمد تھے یہاں کلیم اللہ ملک اور خان محمد اصغر خاں صاحب سے بھی شناسائی ہوئی۔ ان کی گہری دلچسپی سے مجھے بعض نادر حقائق کا سراغ ملا۔ میانوالی کے باشندے اسلام سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ یہاں کے گورنمنٹ کالج میں بہ موسوم "غازی علم الدین شہید" ایک عظیم الشان ہال تعمیر ہو رہا ہے مگر افسوس کہ محبوب خدا کے بے شیدائی اس قبر کا نشان، جس میں آپ امانتاً دفن رہے، محفوظ نہیں رکھ سکے۔ لاوارثوں کا یہ قبرستان جو شاہراہ فضائیہ پر واقع ہے۔ بہ ہزار کوشش صرف اس قدر معلوم ہو سکا کہ وہ جگہ جہاں اس البیلے مہمان نے چند روز استراحت فرمائی، مشرقی دیوار کے نزدیک مگر درمیان میں موجود ہے۔

میں اُردو دان ہوں نہ مجھے اہل زبان ہونے کا دعویٰ ہے۔ میں استاد نہیں طالب علم ہوں۔ یہ کام تو کسی ذمہ دار بزرگ یا تاریخ دان کا تھا۔ چونکہ میرا یہ منصب نہیں، اس لئے مجھے خوشہ چینی کرنا پڑی۔ میں نے متعلقہ عبارتوں سے ہر طرح استفادہ کیا ہے اس تاریخی تالیف کے ماخذ درجنوں، تحریری و تقریری مقالات ہیں۔ حتی المقدور سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی روایات کا سہارا لینے سے گریز کیا گیا ہے۔ نظریہ ضرورت کے تحت بعض روایات تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر مسودے میں شامل کی گئی ہیں قصہ مختصر اپنی طرف سے کوئی اختراعی اضافہ نہیں کیا۔ اس لئے کہ ہر ایک حدیث راویوں کے حوالے سے میں نے قید حروف میں اسیر کر رکھی ہے۔ لہجہ تحریر سے کسی فرد یا اس سے متعلق کسی صاحب کو کوئی عذر ہو تو بالمشافہ یا بذریعہ خط و کتابت رابطہ اچھا رہے گا۔

ماخذ یہ ہیں

۱۔ روزنامہ انقلاب، ۲۔ روزنامہ سیاست، ۳۔ روزنامہ زمیندار، ۴۔ روزنامہ الجمعیت، ۵۔ اے آئی آر ۱۹۳۰ لاہور، ۶۔ روزنامہ کوہستان، ۷۔ عدالتی ریکارڈ ۸۔ روزنامہ مشرق، ۹۔ کتابچہ، پیر غلام دستگیر نامی، ۱۰۔ ہفت روزہ چٹان، ۱۱۔ سیارہ

ڈائجسٹ "رسولؐ نمبر"، ۱۲۔ ضرب کلیم، ۱۳۔ نقوش "لاہور نمبر"، ۱۴۔ تاریخ مسلم لیگ
۱۵۔ پنجاب کی سیاسی تحریکیں، ۱۶۔ حدیثِ دل، ۱۷۔ پرتاپ (جالندھر)، ۱۸ عاشق رسولؐ
اللہ (منظوم)، ۱۹۔ حکایت، ۲۰۔ مقالات کاظمی، ۲۱۔ مکتوبات، ۲۲۔ روزنامہ نوائے وقت
۲۳۔ سرگزشت اقبال، ۲۴۔ بعض ہند و جرائد۔

علاوہ ازیں جن حضرات سے معلومات بہم پہنچیں ان کی تعریف مندرج ذیل ہے۔

حاجی میاں نیاز احمد، شیخ رشید احمد، خان محمد اصغر خاں، کلیم اللہ ملک، میاں سراجدین، (دوست شہید موصوف) میاں معراج دین (دوست شہید موصوف) سید افتخار احمد شاہ "المعروف خاری" (فرزند سید احمد شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل میانوالی ۱۹۲۹ء) محترمہ اقبال بی بی صاحبہ (بھاوجہ شہید موصوف)

میرا کام کسی مذہبی مکتبہ فکر کی ترویج و اشاعت نہیں۔ میں قبر پرست ہوں نہ اسے پسند رکھتا ہوں میں ایک مسلمان ہوں اور میرے تعارف کا معیار بھی یہی ہے۔ مگر میرے جنون کو بعض لوگوں سے گلہ ہے اس لئے کہ ابتدائے شہادت میں ہزاروں پروانے روز و شب غازی علم الدین شہیدؒ کی قبر کی زیارت کے لئے میانی صاحب جایا کرتے اس دوران بعض متعصب افراد نے فتوٰی دیا "لوگ وہاں مرادیں مانگنے جاتے ہیں اور یہ شرک ہے"، کچھ نے کہا "عورتیں اور اوباش قسم کے مرد یہاں برائی کی نیت سے جمع ہوتے ہیں"، بہر حال میں کسی ایسے شقی القلب کو نہیں جانتا جو عبرت گاہوں کو عیاشی کا اڈہ سمجھے اور متبرک جگہوں پر حاضر ہو کر بھی اپنے دل میں مذموم ارادے رکھتا ہو۔ میں جتنی دفعہ بھی شہید رسالتؐ کی آخری آرام گاہ پر حاضر ہوا۔ ہر بار میری روح کو جلا ملی کیا عجب ہے کہ لوگ...... وہاں جائیں اور انکی سوئی ہوئی دینی غیرت بھی تڑپ اٹھے۔

ایسا کہاں بہار میں رنگینیوں کا جوش
شامل کسی کا خونِ تمنا ضرور تھا

یہ... ایک تاریخی نسخہ ہے۔ جو میں ارباب نقد و نظر کے حضور پیش کیا چاہتا ہوں مگر ابھی کام تمام نہیں ہوا۔ خود میرے خیال میں ہنوز کئی پہلو تشنہ طلب ہیں اگر کوئی دل جلا اس موضوع پر قلم اٹھانا چاہے تو بڑی خوشی کی بات ہے تاکہ اسلامی تاریخ کے یہ حقائق پردۂ اخفا سے نکل کر منظر عام پر آجائیں بعض دوستوں نے یہ سوال چھیڑا ہے کہ میں نے کتاب کیوں لکھی؟ بس اسے

انسان رہی کہہ لیجیے۔ ورنہ میں اس قابل کہاں تھا کہ اس موضوع پر خامہ فرسائی کر سکتا۔ مگر سطور برملا کہہ دینا چاہتا ہے میں نے لکھا نہیں ، مجھ سے لکھوایا گیا ہے۔ جس مقام پر میزان عقل سرٹیک ٹیک کر رہ جائیں۔ خرد و شعور فکر کرتے کرتے تھکیں اور ناخنِ تدبیر جہاں دم بخود رہ جائیں۔ وہاں میری پرواز فکر کی کیا مجال کہ نگاہ لڑا سکے۔ یہ عشق کا معاملہ ہے جو نبی آخرالزماں ؐ سے جا ملتا ہے تمنا صرف یہ ہے کہ یوسف کے خریداروں میں میرا نام بھی لکھا جائے۔

اے صبا آج ہمیں راکھ سمجھ کر نہ اڑا
ہم نے جل جل کے تیرے راستے چمکائے ہیں

بالیقین جب راج پال کا قلم آوارہ ہو جائے تو تقدیر کسی علم الدین کو تلاش کرتی ہے۔ میں مقبرہ شہید پر بیٹھا اسی سوچ میں گم تھا خدانخواستہ کہیں پھر امت مسلمہ کی وفاؤں کے امتحان کا مرحلہ پیش آیا تو اب میدان خطابت میں بخاری مرحوم نہیں ہیں۔ جن کی شعلہ نوائی خرمن فکر میں آگ بھڑکا سکے اور علم الدین جیسے نوجوان بھی دکھائی نہیں دیتے گلاب کی طرح مہکتا ہوا جن کا شباب دار و رسن کو زینت بخشے اس لئے عشق و محبت کی یہ داستان اس قابل ہے کہ روشنائی سے لکھنے کی روش ترک کر کے اسے خون جگر کے مقدس قطروں سے غلاف حرم پر رقم کیا جائے تاکہ شاتم رسول حروف کے خنجر سے از خود قتل ہوتے رہے۔

بس — یہی کرب تخلیق ہے۔

یکم نومبر ۱۹۸۲ء

محمد کمال — گل مینشن ، لاہور

قفس کی تیلیاں

- پازیب کی جھنکار سنائی دیتی ہے
- مسلم حکومت کے جہلم پر گویوں کا جشن۔
- تنِ مردہ کے لیے روح کی تلاش!

○

شاعر ان کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو سنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

"جن عورتوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ انہیں
دربدر پھرنا پڑا۔ انہیں رسوا کیا گیا۔ غیرت مند عورتوں نے
کنوؤں میں گر کر جان دے دی۔ بعض کنوؤں میں
اس قدر عورتیں گریں کہ دوسروں کے لیے جگہ نہ رہی۔"

تاریخی لحاظ سے مغلیہ خاندان کی کتاب کے دو حصے ہیں۔ بابر سے عالمگیر تک، ایک عالمگیر سے ظفر تک۔ اس کا پہلا باب حوصلہ افزا اور دوسرا نہایت خونچکاں ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے قاری کو ایقان ہو جاتا ہے کہ اورنگ زیب مغلیہ ترکش کا آخری تیر تھا۔ جس کے بعد وہ فضاؤں کے سینے چیر کر کبھی بلندیوں تک پہنچ نہ سکے۔ اب وہ تلوار کی جھنکار سے گھبرایا کرتے اور قلقل کو حاصلِ زیست سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کی جمعیت خزاں دیدہ اوراق کی مانند منتشر ہو گئی۔ شاہی خاندان کے مقدر کا ستارا گھنیرے بادلوں کی اوٹ میں روپوش ہو گیا اور فرنگی آہستہ آہستہ برصغیر ہندوپاک کے طول وعرض پر قابض ہونا شروع ہو گئے۔

اس نازک دور ابتلا میں بھی بعض مردانِ حُر حفظِ نشیمن کے لیے کوشاں رہے۔ ان میں سلطان فتح علی خان اور نواب سراج الدولہ کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ سلطان ٹیپو کی شکست تاریخِ ہند کا ایک المیہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ شیر میسور کی موت سے اس خطۂ ارض میں اسلام کی برق پاش شمشیر ایسے گم ہوئی کہ آج تک نہیں مل سکی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد گوروں کا راستہ صاف تھا۔ کیونکہ دہلی کا یادگار دور ختم ہوا۔ بزم مغلیہ کا آخری چراغ آخری ٹمٹماہٹ کے ساتھ بجھ گیا اور مسلمان ذلت ناک شکست سے دوچار ہو گئے۔

اب مسلمان فاتح انگریز کے رحم وکرم پر تھے۔ جس نے مفتوحہ قوم کے ساتھ نہایت انسانیت سوز سلوک کیا۔ جس روز فتح کا جشن منایا گیا۔ دہلی میں ہر طرف اجنبی حکمرانوں کے شرابی قہقہے سنائی دیتے تھے "تاریخ مسلم لیگ" کے مصنف ڈاکٹر عارف بٹالوی، ہوڈسن کے مظالم کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔ "بہادر شاہ ظفر کے دو شہزادے مرزا مغل اور مرزا خضر اور تیسرا ان کا پوتا ابوبکر یعنی مرزا فتح الملک مرحوم کا بیٹا ہمایوں کے مقبرے میں چھپے بیٹھے تھے کہ ہوڈسن نے آکر انہیں گرفتار کر لیا۔ شہزادے سائبان والی گاڑی میں مقبرے سے باہر نکلے۔ شہزادوں کے ساتھی بیل گاڑی کے پیچھے پیچھے تھے اور ہوڈسن کا فوجی دستہ ان سب کی نگہبانی کر رہا تھا۔ راستے میں ہوڈسن پر خون سوار ہو گیا۔ وہ گھوڑا دوڑا کر بیل گاڑی کے سامنے آیا اور بیل گاڑی روک کر شہزادوں کو حکم دیا۔ باہر نکل آؤ۔ وہ باہر نکل آئے پھر حکم ہوا کہ لباس اتار دو۔ انہوں نے لباس اتار دیا۔ ہوڈسن نے چیخ کر کہا اے لوگو! اب ان کا انجام دیکھو! اس کے بعد آن کی آن میں سب کو قتل کر دیا گیا۔ ہوڈسن

نے اپنے ہاتھ سے گولی چلائی اور شہزادے ہائے دھوکہ کہہ کر زمین پر گرے اور تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ انکی لاشیں تین روز تک کوتوالی کے چبوترے پر پڑی رہیں، پھر ان لاشوں کو لٹکوا دیا گیا۔ دہلی کے آس پاس جتنے شہزادے ملے۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی تعداد ۲۹ تک پہنچ چکی تھی ان میں بیمار بھی تھے اور کم سن بھی۔ ان سب کو پکڑ کر پھانسی پر لٹکوا دیا گیا۔ جن عورتوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ انہیں در بدر پھرنا پڑا۔ انہیں رسوا کیا گیا۔ غیرت مند عورتوں نے کنوؤں میں گر کر جان دے دی۔ بعض کنوؤں میں اس قدر عورتیں گریں کہ دوسروں کے لئے جگہ نہ رہی۔"

انگریز مصنّف رابرٹس نے اپنی کتاب "فارٹی ون ایرسں ان انڈیا" (Forty One-Years In India) میں ان دنوں کا حال یوں لکھا ہے "صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا۔ جب لاہوری دروازے سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے گذرے۔ دہلی حقیقت میں شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے گھوڑوں کے سموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گذری۔ ہر طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر لاش پر وُہ عالم طاری تھا۔ جو موت کی کش مکش سے طاری ہوتا ہے۔ ہم چپ چاپ جا رہے تھے۔ جس منظر سے ہماری آنکھیں دوچار ہوتیں۔ وُہ بڑا ہی خوفناک اور انتہا درجہ رنج افزا تھا۔ دراصل یہ پورا منظر ایسا ہیبت ناک اور دہشت انگیز تھا کہ بیان میں نہیں آسکتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے گھوڑوں پر بھی اس خوفناک عالم کا اثر ہوگیا ہے وہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے۔ پوری فضا ناقابلِ تصوّر حد تک بھیانک تھی" جب قومیں شکست سے دوچار ہوجائیں تو معرکۂ خاک و خون کو بغاوت اور آزادی کی جنگ کو غدر کا نام مل جاتا ہے۔ قلم انگریز کا تھا اور مورخ بھی، چنانچہ حق و باطل کے اس معرکے پر بغاوت کی مہر لگا دی گئی۔ چونکہ اس سے قبل حکمران قوم مسلمان تھی اور مسلمان ہی مزاحمت کا اصل سبب تھے۔ اس لئے ملتِ اسلامیہ ہند نو وارد قوم کے دل میں کھٹک رہی تھی۔ ہندو کی ہرجائی فطرت نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ روایتی چاپلوسی سے انہوں نے انگریز کو رام کر لیا۔ وہ اپنے خوشامدانہ لہجے کی کرشمہ سازیوں سے قریب قریب اور مسلمان تنفّر کی چنگاریوں کے سبب فرنگیوں سے دور دور ہوتے چلے گئے۔ گویا جنگِ آزادی کی انتہا مسلمانوں پر مظالم کی ابتدا تھی۔

تاج برطانیہ نے مسلمانوں کے جذبۂ حریت کو گہری نیند سلانے کے لیے کئی نسخے آزمائے۔ فن کارانہ صلاحیتوں سے ظلمات فروش نبی پیدا کیے۔ کلیسائی نظام تعلیم رائج کیا گیا۔ وظیفہ خوار علماء اور جھگڑالو ملاؤں کے ذریعے فرقہ ورانہ فسادات کو ہوا دی گئی۔ مدت ہائے دراز کے بعد ہندوستان والوں نے ایک کروٹ بدلی اور ان کے نرم و نازک ہاتھ فرنگی گریبان کی جانب دراز ہونے لگے۔ ۱۸۸۵ء میں اکابر ہندوؤں نے کانگریس کی بنیاد رکھی۔ جس کے مقاصد پہلے محدود اور پھر لامحدود ہوتے چلے گئے۔ مسلمان شروع ہی سے آزادی پسند ہیں۔ اس لیے وہ بھی دھڑا دھڑ اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ ہندو مسلم اتحاد کی تحریک نے زور پکڑا اور مسلمان اکابرین نے مخلصانہ کوششیں شروع کر دیں۔ اس وقت محمد علی جناح ؒ کو پیغمبر اتحاد کہا جانے لگا۔ جب ہندو مسلم اتحاد عمل میں آیا تو آزادی کے لیے بھرپور مطالبے ہوئے۔ مختلف سیاسی تحریکوں نے اس مطالبے کو اس قدر تقویت پہنچائی کہ انگریز بھی سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ اس موقع پر مولانا احمد رضا خاں بریلوی ؒ نے سادہ لوح مسلمانوں کو خبردار کیا "کہ تمام غیر مسلم ایک قوم ہیں۔ عیسائی ہوں یا ہندو وہ سب اسلام کے دشمن ہیں۔ ان پر اعتماد کرنا قرآنی اصول کی خلاف ورزی ہے۔" ترکِ موالات کی تحریک چلی تو آپ نے فرمایا۔ "ابھی مسلمانوں کی ایک آنکھ کھلی ہے اور دوسری بند ہے۔" یعنی وہ ایک دشمن کو دشمن اور دوسرے دشمن کو دوست سمجھتے ہیں۔ بعد میں آپ کی یہ پیشین گوئی بالکل درست ثابت ہوئی۔ ہندوؤں کی سرشت کوؤں اور کتوں کی طرح ہے۔ وہ ہمیشہ مکر و فریب اور دیگر ہتھکنڈوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ہندو چاہتے تھے کہ انگریز کے جانے پر وہ سیاہ و سفید کے کلی مالک بن جائیں اور محکوم مسلمانوں پر اپنی روایات ٹھونس دیں۔ اس وقت معاندین اسلام نے اس ناقابلِ انکار حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا کہ مسلمانوں نے یورپ، براعظم افریقہ اور ایشیاء کے وسیع و عریض علاقوں کو فتح کرنے کے باوجود مفتوحہ قوموں کے مذہبی جذبات و احساسات کا ہمیشہ احترام کیا۔ یہ کہنا حق بجانب ہے کہ اگر مسلمان فاتحین نفرت اور تشدد کو اپنا شعار بنا لیتے تو مشرقِ وسطیٰ، یورپ بلکہ براعظم ایشیاء و افریقہ اور پورے برصغیر ہند و پاک کے کسی خطہ میں آج ایک بھی غیر مسلم موجود نہ ہوتا۔ لیکن کم و بیش آٹھ سو برس مسلمانوں کے زیرِ نگیں رہنے والے ہسپانیہ، برصغیر ہند اور دیگر ممالک میں ہندو مت، یہود و نصاریٰ آج بھی دورِ رفتہ کے

وقار و تمکنت کے ساتھ موجود ہیں۔ مگر ان ناقابلِ تردید حکایات کو جھٹلا دیا گیا اور منظم طریقے سے مسلم کشی کا آغاز ہوا۔ جس سے ہندوؤں کی بدنیتی آشکارا ہو گئی۔ اکابرینِ ملتِ اسلامیہ ان دم بریدہ سگانِ برطانیہ کے دندانِ آز سے پہلے ہی زخمی تھے۔ ہندو مسلمانوں کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ ادھر اس فعال قوم نے اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

لہٰذا اس کشمکش میں ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو گیا اور انیسویں صدی کے آغاز میں نواب سلیم اللہ خان نے مسلم شاہیر کی تائید و تحریک سے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ پہلی جنگِ عظیم جو روئے زمین پر ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک لڑی گئی۔ انگریزوں کے لیے مضر ثابت ہوئی گو وہ اس معرکے میں فتح یاب ہوئے لیکن ان کی عسکری قوت کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور جنگی و داخلی اعتبار سے وہ کمزور ہو گئے۔ مقامی باشندے پہلے ہی ان کے خون کے پیاسے تھے سول نافرمانی اور ترکِ موالات کی تحریکیں بامِ عروج پر تھیں پھر تاریخ میں ایک ایسا موڑ آیا کہ دوسری عالمی جنگ کے اثرات سے تو وہ بالکل ہی لاغر ہو رہے ۔ ان مخدوش حالات میں فرنگی اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے۔ اور ہندوستان سے کوچ ان کے لیے ناگزیر ہو گیا۔ اعلانِ آزادی کے ساتھ ہی ہندو مت کے خواب ادھورے رہ گئے۔ شدھی و سنگھٹن جیسی قابلِ نفرین تحریکیں کارگر ثابت نہ ہوئیں۔ جن کی غرض و غایت دینِ متین سے برگشتہ کرنا اور پیغمبرِ اسلام سے نفرت و عداوت تھی۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ رسولِ عربی کے غلام تاریخ کے اس دور اپنے تک کیسے پہنچے اس عرصے میں آلام و مصائب کے کون کون سے پہاڑ گرے؟ خاک و خون کے پرپیچ و دشوار گذار راستے کن حالات میں طے ہوئے۔ کس نے کیا جرم کیا۔ مزید یہ کہ بے وفا کون تھا اور باوفا کون ہے؟

ضبطِ فغاں کب تک

- جب گنبدِ حضریٰ کانپ رہا تھا۔
- بہتے ہوئے پانی پر بنیادِ مکاں رکھ دی۔
- عطاءاللہ شاہ بخاری کی شعلہ نوائیاں۔

⊙

؎ یہ کچّی آگ ہے اس سے دھواں اٹھنا یقینی ہے
شروعِ عاشقی میں کوششِ ضبطِ فغاں کب تک

"آج کوئی روحانیت کی آنکھ سے دیکھنے والا ہو تو دیکھ سکتا ہے کہ حضرت رسولِ اکرمؐ اور ان کی ازواجِ مطہراتؓ ہم مسلمانوں کی مائیں، لاہور کے مسلمانوں سے فریاد کر رہی ہیں کہ تمہارے شہر میں ہماری بے حرمتی کی جا رہی ہے۔ ہمیں کھلے بندوں گالیاں دی جاتی ہیں۔ اگر کچھ پاسِ رسالت ہے تو ناموسِ رسالت کی حفاظت کرو!"

گذشتہ چند صدیوں کے دوران بعض مسیحی مورخین، اہلِ ہنود اور یہودی مصنفین نے بارہا اپنی تنگ نظر فطرت کا ثبوت دیا ہے۔ کوئی نہ کوئی بدزبان اور کج قلم مذہبی دلآزاری کا سامان جمع کر کے مسلمانوں کے تاریخی ورثے اور جذبات و احساسات کا تمسخر اڑاتا رہا ہے۔ مشاہیرِ ملتِ اسلامیہ کو مطعون و متہم کرنے کی ناپاک جسارت ان کی دیرینہ فطرت ہے۔ بزرگانِ اسلام کی شان میں کذب و افترا اور دریدہ دہنی کا ان کی طرف سے کئی بار اعادہ ہوا ہے۔ مختلف ادوار میں رسولِ عربی ؐ کی اہانت پر مبنی طبع ہونے والے رسائل کی فہرست بھی طویل ہے۔ ان کی ایک تعداد نشترِ قلم سے تاریخی حقائق کا پیٹ چاک کر کے ہمیشہ فتنے جگانے میں ہمہ تن مصروف رہی ہے جس سے قلوبِ مسلم میں غیظ و غضب کا لاوا ابلتا ہے اور غم و اضطراب کی لہر دوڑ جاتی ہے اور مودت کیش مسلمانوں کے نازک آبگینوں کو سخت ٹھیس پہنچتی ہے۔ اس کی ایک دو نہیں سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ کئی بار شعائرِ اسلام کی صداقت و عظمت کو جھٹلایا گیا اور افضل البشر ؐ کی پاکیزہ سیرت پر سوقیانہ و رکیک حملے کر کے اہلِ ایمان کی عقیدت کو آزمائش میں ڈالا گیا۔

اس خطۂ ارض پر بیسویں صدی کے ربعِ اول میں ایک آریہ سماجی لیڈر نے "ستیارتھ پرکاش" جیسی بدنام کتاب لکھنے کا ارتکاب کیا جس کے چودھویں باب میں قرآنی آیات، نظریۂ توحید، اکابرینِ ملتِ اسلامیہ اور محسنِ انسانیت ؐ کی سیرتِ طیبہ کا مضحکہ اڑایا گیا تھا۔ مسلمانانِ ہند کے لیے تاریخ کا یہ دور نہایت پرآشوب تھا۔ ایک طرف کانگریس متحدہ ہندوستانی قومیت کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کے سیاسی وقار کا خاتمہ چاہتی تھی اور دوسری جانب آریہ سماجی لیڈر شدھی اور سنگھٹن ایسی مذموم تحریکیں چلا کر مسلمانوں کے دلوں پر چرکے لگا رہے تھے۔ شدھی کی اس اشتعال انگیز تحریک کا بانی ایک ہندو منشی رام تھا۔ جو چند برس پنجاب پولیس میں ملازمت کرتا رہا۔ پھر وکیل بنا اور بعد ازاں ترکِ دنیا کا ڈھونگ رچا کر گیان دھیان کی نام نہاد زندگی گزارنے لگا۔ اسی دوران اسے پراسے سوامی شردھانند کا خطاب ملا۔ اب وہ منشی رام کی بجائے سوامی شردھانند کے روپ میں ایک مذہبی پیشوا تھا۔ جلد ہی وہ پنجاب کو چھوڑ کر یوپی چلا گیا۔ جہاں ۱۹۲۳ء میں شدھی جیسی پرفتن تحریک کی بنیاد رکھی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اپنا مرکز دہلی بنا لیا اور مذہبی دلآزاری پر مبنی شرانگیز لٹریچر شائع کرنے لگا۔ اسے بعد میں قاضی عبدالرشید شہید رح ایک مسلم مجاہد نے موت کے گھاٹ اتار دیا اور اپنے نام

کو زندگی جاوید عطا کی۔ سوامی شردھانند کے علاوہ رشی دیانند کی مسلم دشمنی بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ مسلم کشی کا جامع منصوبہ اور اپنی انجمن کا لائحہ عمل انہوں نے اکٹھے ہی تیار کیا تھا۔ جس کی بنا پر مشہور مہا بھائی پنڈت مدن موہن مالویہ نے انجمن "انسدادِ گئو کشی" کی بنیاد رکھ کر امن و قرار کے محل خاکستر کر دیے۔ جس سے پورے برصغیر پر قتل و غارت کی فضا چھا گئی۔ ہر طرف آگ کے لپکتے ہوئے شعلے دکھائی دینے لگے۔ تمام قابلِ ذکر شہر ہندو مسلم فساد کا اکھاڑہ بن گئے اور ان گنت مسلمان تہِ تیغ کیے گئے۔

ان معاندانہ تنظیموں کے مقاصد کی فہرست خاصی طویل ہے جن میں برصغیر کے مسلمانوں کو ہندو بنانا اور شدھی کے دامِ گرفت سے ہوشیار رہنے والوں کا جبر و تشدد کے ساتھ خاتمہ شامل ہے۔ اس ناپاک منصوبہ بندی میں عیسائی، ہندو اور یہودی برابر کے شریک تھے۔ اس مذموم خواہش کے پس منظر کا اگر بنظرِ عمیق جائزہ لیا جائے تو ہندوؤں کے ازلی و ابدی چہرۂ رقابت سے نقاب خود بخود اٹھ جائے گا۔ جس کے خبط میں اندھے ہو کر انہوں نے پہلے ملی بھگت سازشوں سے مسلم حکومتوں کا خاتمہ کیا اور اب غیر منقسم ہندوستان سے اسلام کو ختم کرنے کی بے جا جسارت کے مرتکب ہو رہے تھے۔

ہندوؤں کی بڑی کوشش تھی کہ مسلمان ایک فعال قوم کی حیثیت سے نہ ابھر سکیں۔ تاکہ وہ بلا شرکتِ غیرے برصغیر ہندو پاک کے سیاہ و سفید کے کلی مالک بن جائیں اور یہاں رام راج قائم ہو جائے۔ چنانچہ ہندو رہنما پنڈت مدن موہن مالویہ نے ہندو مہاسبھا کو از سرِ نو منظم کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ سوامی شردھانند اور لالہ لاجپت رائے نے ہندو دماغ میں یہ خیال جاگزیں کیا کہ بھارت ورش کی حقیقی ٭ مالک آریہ جاتی ہے۔ حق دشمنی اور مسلم کشی کے منشور پر مختلف الخیال ہندوؤں میں اتحاد پیدا ہو جانا ایک فطری عمل تھا۔ چنانچہ اس دھرتی پر غریب مسلمانوں اور اچھوتوں کو ترغیب و تحریص اور جبر و تشدد کے ذریعے ہندو بنانے کا اچھوتا تجربہ کیا گیا۔ شدھی تحریک کے اثرات صوبہ یوپی سے نکل کر بڑی سرعت رفتاری کے ساتھ پورے برصغیر میں پھیل گئے۔ ۱۹۲۳ء کے آخر میں ایک اور کتاب طباعت کے مراحل سے گذر چکی تھی۔ ۱۹۲۴ء کے اوائل میں راجپال کتب فروش نے اسے ہسپتال روڈ لاہور سے شائع کیا۔ اس سوقیانہ عبارت کا نام ہی اس قدر اشتعال انگیز تھا

کہ تن بدن میں بجلیاں دوڑ جاتی ہیں اور غیرتِ ایمانی سے اسے سننا گوارا نہیں کرسکتی۔ نقل کفر کفر نباشد کے مصداق کذب و افترا سے بھرپور اس ناپاک دفتر کا نام "رنگیلا رسول" تھا۔ اس توہین آمیز کتاب کا مصنف کون تھا؟ اس بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے اور ہمیشہ دو تین نام لیے جاتے رہے ہیں۔ ایک "پرتاب" اخبار کے مالک و مدیر مہاشہ کرشن کا، جس کے راجپال کے ساتھ کاروباری مراسم تھے اور دوسرا ڈی اے وی کالج کے پروفیسر پنڈت چمپاپتی لال ایم اے پر شبہ ظاہر کیا جاتا ہے اغلب قیاس بھی آخر الذکر کے متعلق ہی ہے۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء کے ماہنامہ حکایت میں ایم ایس ناز کا ایک مضمون "میانوالی جیل کا قیدی نمبر ۱۰۵" شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ فقیر سید وحید الدین کے نزدیک اس بدنام زمانہ رسالے کا راقم راجپال خود ہے۔ وہ اس لیے کہ مہاشہ راجپال خود بھی تصنیف و تالیف کا مذاق رکھتا تھا اور اسے ہندی زبان کا ایک اچھا انشاء پرداز سمجھا جاتا ہے۔ غازی علم الدین شہیدؒ کی حقیقی بھتیجی محترمہ انور سعید صاحبہ کا ایک آرٹیکل یکم نومبر ۱۹۶۴ء کو نسیم حجازی کے اخبار "کوہستان" میں چھپا۔ بقول ان کے اس کتاب کا مصنف درحقیقت چنتامنی ایک ہندو تھا۔ جو خاصا گم نام آدمی تھا۔ مصنف کی گم نامی کی وجہ سے لوگوں کا خیال راجپال اور دیگر مصنفین کی طرف مرکوز ہو گیا۔ بہر صورت اس کتاب کا مصنف راجپال خود نہ تھا۔ راقم کے نزدیک اس دلآزار رسالے کا محرک و مؤید پروفیسر چمپاپتی ہے اور اصل مصنف چنتامنی تھا۔ اس لئے وہ ناقابل خواند تصنیف چنتامنی اور پروفیسر چمپاپتی کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ان کے آپس میں دوستانہ تعلقات بھی اس موقف کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس نسبت سے یقین مزید پختہ ہو جاتا ہے کہ وہ دونوں آریہ سماج تنظیم کے متعصب کارکن بھی تھے۔

اب آگے اس میں تمہارا نام آئے گا
جو حکم ہو تو یہیں چھوڑ دیں فسانے کو

ہندوؤں کی ایک چال یہ تھی کہ وہ اس تلخ و نازک معاملے میں کسی آزاد خیال مسلمان کو ملوث کریں اس زمرہ میں بعض پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔ یہ امر خاصا حیران کن ہے کہ اس رسوائے زمانہ کتاب کی عبارتی غلطیاں علامہ تاجور نجیب آبادی نے درست کی تھیں۔ جو اس وقت ایک ہندو پرنٹنگ پریس "مکتبہ منشی گلاب سنگھ" میں ملازم تھا۔ مذکورہ کتاب کی پرنٹنگ بھی اسی پریس سے

ہوئی تھی۔ مذاق تحقیق رکھنے والے اس کے ثبوت میں راجپال کا وہ بیان پیش کرتے ہیں۔ جس میں اس نے کہا تھا "مسلمان خود بھی اس کتاب کو قابلِ اعتراض نہیں سمجھتے۔ اگر واقعی یہ مجموعہ بہتان ہوتا تو علامہ تاجور نجیب آبادی ہرگز نظرِ ثانی نہ کرتے"۔ اس سلسلے میں جب غازی علم الدین شہیدؒ کے حقیقی بھتیجے رشید احمد سے رابطہ قائم کیا گیا تو انہوں نے بھی مندرج روایت کی تصدیق فرمائی۔ بہرحال وہ اہانتِ رسولؐ کا ایک ناپاک دفتر تھا۔ جس میں فحش اور بے ہودہ الزامات تراشے گئے۔ گستاخ زبان اور کج قلم نے امام الرسلؐ کی تعداد ازواج پر فقرے کسے اور خانوادۂ نبوت کی حرمت و تقدیس کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا۔

تاریخی حقائق میں تحریف و تغیر کر کے اس مجموعہ کی اشاعت کا وہی دیرینہ مقصد تھا کہ نیم پڑھا لکھا طبقہ دینِ حق سے متنفر ہو جائے اور مسلمانوں کے دلوں سے خاکم بدہن شفیع المذنبین کی عظمت و تقدیس جاتی رہے۔ لیکن یہ منصوبہ بندی کرنے والوں کی انتہائی خام خیالی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں سے حرمتِ مصطفےٰ محو کر دیں۔ کیونکہ ملتِ اسلامیہ کے تشخص کا معیار واضح طور پر حبِ مصطفےٰ ہے۔ ایسا غیر اخلاقی لٹریچر شائع کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس دوران سینکڑوں ستم رسیدہ افراد روزانہ حلقۂ بگوش اسلام ہو رہے تھے اور ہندو بوکھلا کر ایسے اشتہارات شائع کرنے لگے یہاں امیرِ ملت حضرت جماعت علی شاہ محدث علی پوریؒ کا تذکرہ نہ کرنا صریحاً ناانصافی ہو گی۔ انہوں نے گھر گھر جا کر نومسلموں کو استقامت کی تلقین فرمائی اور وقتاً فوقتاً ان کی مالی معاونت بھی فرماتے رہے۔

پروفیسر پنڈت چمپاتی لال اور چنتامنی کی اس کتاب کو سوامی شردھانند کے ایک معروف چیلے راجپال نے شائع کیا۔ اس کتابچے میں سوقیانہ اندازِ بیان اور معاندانہ طرزِ تحریر کی یہ کیفیت تھی کہ اس کے پڑھنے اور سننے سے بیشتر ہر مسلمان مر جانے کی دعا کیا کرتا۔

مہاشہ راجپال ایک کتب فروش تھا۔ جس کی دکان پر بالخصوص آریہ سماجیوں کی مذہبی کتابوں کی خرید و فروخت ہوا کرتی۔ اس کی دکان انارکلی بازار میں ہسپتال روڈ پر پان گلی کے قریب واقع تھی۔ جس پر "راجپال اینڈ سنز" کا بورڈ آویزاں تھا۔ مسلم مسجد کے سامنے سے نئی انارکلی میں داخل ہوں اور سینٹرل ہوٹل سے ہسپتال روڈ کی جانب مڑ جائیں تو آج کل وہ جگہ ہسپتال روڈ نمبر ۲ پر یونائیٹڈ پریس اور مغل آرٹ پریس کے عین مقابل واقع ہے۔ اس دکان پر اب سگریٹ سپاریاں وغیرہ

فروخت کی جاتی ہیں۔

ناشر نے اس کتاب پر فرضی نام دے کر قانونی تقاضا پورا کر دیا تاہم خود راجپال کا نام و پتہ درست اور واضح لکھا ہوا تھا۔ مصنف کا نام لکھنے سے کیوں گریز کیا گیا؟ اس کی دو وجوہ ہیں! تاکہ اس کے خلاف کوئی اخلاقی یا قانونی کارروائی نہ ہو سکے۔ اس کا دوسرا پہلو بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ مصنف مسلمانوں کے ایمان کی پختگی اور فرزندانِ توحید کے غضب و غصے سے بھی خائف تھا۔

O

خاصے عرصے تک یہ کتاب صوبائی حکومت کی پریس برانچ کی نگاہ سے بھی چھپی رہی یا انہوں نے احتساب و مواخذے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ایک مدت بعد جب اس پر مسلمانوں کی نظر پڑی تو انہوں نے ازراہِ اخلاق پبلشر پر زور دیا کہ وہ ایسی ہزل کتاب کو تلف کر دے۔ مگر آریہ سماج کی پشت پناہی کی وجہ سے اسے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا قطعاً احساس نہ ہوا۔ راجپال کے قطعی انکار کی صورت میں شدید ردِ عمل کا مظاہرہ فطری امر تھا۔ اس سے پورے پنجاب کے مسلمانوں میں اضطراب و ہیجان کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ دلوں میں غیظ و غضب کا لاوا ابلنے لگا اور ہر جانب غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔

جب اس کتاب کی ضبطی کے لئے اقدامات کا آغاز ہوا تو برطانوی حکومت نے جلسوں کے انعقاد پر پابندی عائد کر دی اور لاہور میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔ ان ہتھکنڈوں سے جب مسلمانوں کا جوش و خروش سرد نہ پڑا تو حکومت نے مجبوراً ناشر کے خلاف فرقہ ورانہ منافرت پھیلانے کے الزام میں دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت مقدمہ دائر کر دیا۔ ۲۴ مئی ۱۹۲۴ء کو یہ مرافعہ لاہور کے ایک مجسٹریٹ مسٹر سی۔ ایچ ڈزنی کی عدالت میں پیش ہوا۔

دورانِ تفتیش شاہی مسجد کے خطیب مولانا غلام مرشد صاحب بھی عدالت میں حاضر ہوئے۔ جرح کے دوران آپ نے مدلل تقریر فرمائی۔ آپ نے کہا " بلاشبہ اس ناخواندہ رسالے میں بعض ہماری معروضہ کتب کے حوالہ جات منقول ہیں۔ لیکن ایک غور طلب امر یہ ہے کہ وہ کتابیں کیسی ہیں اور ان کے متعلق مسلم رائے عامہ کیا ہے؟ ہمارا عقیدہ ہے اگر دل کے کسی گوشے میں رسولِ اکرم ﷺ کی اہانت کا خیال بھی جاگزیں ہو تو آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کتابیں ہمارے نزدیک کیونکر معتبر ہو سکتی ہیں۔ قرآن حکیم ہمارے لئے حجت ہے اور صحاح ستہ ہمارا مقدس مذہبی ورثہ ہے۔ کہیں بھی

ان کا کوئی حوالہ موجود نہیں - اس ہتک آمیز ناول میں جمع شدہ حوالہ جات ہمارے نزدیک غیر معتبر ہیں ان کے لکھنے والے قابلِ گردن زنی اور کافر ہیں۔ ہم ان کو مرتد اور منافق سمجھتے ہیں ۔"

ان صفحات میں حاصل سیر گفتگو کی گنجائش ہے اور نہ اسے قابلِ نفرین کتاب کے موضوع سے خاص وابستگی ہے مگر میری بعض ایسے خام طبع افراد سے ملاقات ہوئی ہے جو اس غیر ضروری بحث میں اُلجھ کر شہید علم الدین غازی رح کی فضیلت کا بھی انکار کر دیتے ہیں ؎

اپنوں کی بے وفائی پہ ہم روئے دیر تک
شہرِ وفا میں جب کوئی بیگانہ مل گیا

بعض آزاد خیال لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان بھی برابر کے قصور وار تھے۔ انہوں نے آریہ سماجیوں کی طرح جابجا تنگ نظری کا مظاہرہ کیا اور مذہبی اختلافات کی بناء پر قتل و تشدّد کی طرح ڈالی۔

دراصل یہ نقطۂ نظر ان لوگوں کا ہے۔ جو رسولِ اکرم ﷺ کی توہین کو قابلِ گرفت جرم خیال نہیں کرتے اور جو اس زمرے میں شمار نہیں ہوتے وہ اس دور کے سیاسی اور مذہبی حالات سے مطلقاً بے خبر ہیں۔ اہلِ عشق کے نزدیک نقل کفر کفر نباشد کے مصداق بھی بیہودہ کلمات بولنا سوءِ ادب ہے غالباً اسی وجہ سے کچھ لکھتے ہوئے سینۂ قلم شق اور جگرِ قرطاس پارہ پارہ ہوا چاہتا ہے۔ اس کے باوجود دل پر ہاتھ رکھ کر، استغفار کا ورد کرتے ہوئے کچھ نقل کرنے کی جستجو کر رہا ہوں کہ شاید یہ چیدہ چیدہ مستند مثالیں انکی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ثابت ہوں اور ان کا زاویۂ نگاہ بدل جائے۔ پھر وہ سمجھ سکیں گے کہ غیر مسلموں نے جس انداز کو اپنایا تھا۔ وہ کس قدر بازاری اور اشتعال انگیز تھا اور شہدائے رسالت ﷺ نے جو کام کیا اس کی کیا قدر و قیمت ہے۔

بمبئی میں ایک ماہوار رسالہ "گجرات" نامی میں اس کے ایڈیٹر مسٹر کھنیا لال منشی نے اداریے میں لکھا۔

"اگر محمد ﷺ کی نسبت ڈرامہ تحریر کیا جائے تو جو تھیٹر اسے سٹیج پر کرے گا۔ اس کا دیوالیہ نکل جائے گا۔ کیونکہ اس کو اتنی لڑکیاں نہیں مل سکیں گی جو ازواجِ مطہرات محمد ﷺ کا پارٹ ادا کر سکیں۔" زمیندار ۱۲ اپریل ۱۹۲۶ء۔

امرتسر میں ۱۴ اگست کو بعد از دوپہر کارخانہ قالین بافی واقع کٹڑہ حکیماں کے ایک اکاؤنٹنٹ

بابو رام نند انے قرآن پاک کی شان میں چند بےہودہ کلمات ناپاک زبان سے نکالے۔(اخبار ۲۰ اگست ۱۹۲۷ء)۔

۲۴ اگست کا واقعہ ہے کہ پشاور میں ہیلتھ آفیسر کے حکم سے تین کتوں کو زہر دیا گیا۔ ان میں سے دو کتے فوراً ہلاک ہو گئے۔ لیکن ایک کتیا بھاگ گئی۔ اس پر ایک آریہ سنار نے آوازہ کسا۔ "امام... امام...... تو مر گئے اور...... بھاگ گئی"۔ ان ناپاک اور دلخراش کلمات کو سن کر مسلمانوں میں بے حد جوش پھیلا۔ مگر انتظامیہ نے دور اندیشی سے کام لے کر ملزم کو گرفتار کر لیا۔ جس سے ایک سخت فساد ہوتے ہوتے رُک گیا (انقلاب ۴ ستمبر ۱۹۲۹ء)۔ انگلستان میں میسرز ہچنس اینڈ کمپنی لندن نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ایک کتاب شائع کی ہے اس کتاب میں آقائے نامدار کے خلاف نہایت سفیہانہ ہرزہ سرائی کی گئی ہے۔ اس سے قبل ۱۹۲۵ء میں اخبار "سٹار" نے بھی ایک توہین آمیز کارٹون شائع کیا تھا۔ مگر بعد ازاں اس نے معذرت شائع کی۔ (اخبار ۵ نومبر ۱۹۲۷ء) دہلی میں تو آریہ کانفرنس کے ارکان نے ایک قرارداد کی رو سے مطالبہ کیا ہے کہ "قرآن پاک کی ان آیات کو ضبط کیا جائے۔ جن میں کافروں کے قتل کی تلقین کی گئی ہے"۔ اس سلسلے میں اخبار "تیج" کا ایڈیٹر دیش بندھو جی پیش پیش تھا۔ (اخبار ۴ نومبر)

بغداد کا چور، عمر خیام اور شیرازہ ایسی فلمیں ہیں جو آج کل ہندوستان میں پردۂ سکرین پر دکھائی جا رہی ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، آئمہ کرام اور ہارون الرشید کی بیٹی کی سخت توہین کی گئی ہے (انقلاب ۲۰ ستمبر ۱۹۲۹ء)

"ستیارتھ پرکاش" میں قرآن حکیم کو ریاکاری اور منافقت کا مجموعہ اور قابل ضبطی قرار دیا گیا۔ دیگر ازاں تمام مذاہب کو بُرا بھلا کہا گیا تھا۔ "سنگھٹن کا بگل" سوامی شردھانند کی ایسی تصنیف تھی۔ جس میں جبر و تشدد سے مسلمانوں کو شدھی کرنے اور ہندو بنانے کی ترغیب دی گئی۔ محققین سمجھتے ہیں کہ اگر تاریخی حقائق سے پردہ اٹھا دیا جائے تو کئی پردہ نشین بے پردہ ہو جائیں گے اور سینکڑوں دل تڑپ اٹھیں گے۔ میں گریزاں تھا کہ گڑے مردوں سے کفن نہ کھینچوں۔ لیکن اب تاریخ کا مدفن کریدنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ میں احتیاط کا دامن تھامے فی الحال اختصاراً مگر ضروری نکات پر اکتفا کرتا ہوں۔ ہم میں ایک ایسا ناقص العقیدہ فرقہ موجود ہے جو بعض مشاہیر اسلام سے قلبی بغض و

عناد رکھتا ہے اور ان پر الزام تراشیوں کے جنون میں اس مسلک کے لوگ نادانستہ طور پر سرورِ کونینؐ کی تحقیر بھی کر گزرتے ہیں

مرزا قادیانی کذاب ہے۔ جھوٹے نبی اور اس کے پیروکار کم و بیش نوے سال تک مسلمانوں میں گھلے ملے رہے ہے۔ ان کی کوئی تصنیف ہمارے لیے بھلا کیونکر قابلِ اعتبار ٹھہر سکتی ہے خواہ! وہ کسی ہی دور میں کیوں نہ لکھی گئی ہو۔

ملاعلی قاری نے سیدالمرسلینؐ کے والدین معظمین کی کفر پرستی پر بہت زور دیا ہے لیکن آخیر میں رجوع کر لیا اور توبہ کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ کوئی آدمی اگر ان کی ابتدائی کتب کے حوالے سے یہی بات دہرائے اور کہے کہ یہ ایک مسلمان کا عقیدہ ہے وہ اس کی لاعلمی و کم عقلی اور ازلی و ابدی دشمنی کے سوا اور کیا ہے؟ ایک مکتبۂ فکر میں بعض ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ جنہوں نے خیر الامم کی ذاتِ بارکات کو اپنے بڑے بھائی کی صورت میں دیکھا یا گاؤں کے چوہدری کی حیثیت سے مانا ہے ایسے بدبخت و نام نہاد مسلمان محسن انسانیت کی سیرت و کردار کو اپنی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ عقل سلیمہ تو وہ رکھتے ہی نہیں اور ایمان و عشق سے محرومی کے سبب اس مقدس ہستی پر تنقید کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

فرزندانِ توحید کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی خاطر غیر مسلم مصنفوں اور مستشرقین مورخوں نے بھی منافقانہ روپ میں انتشار و افتراق کا کثیر سامان جمع کر رکھا ہے۔ نیم لکھا پڑھا طبقہ کسی وقت بھی ان کے لٹریچر سے بہک سکتا ہے۔

مذکورہ بالا ذرائع سے جمع کیا جانے والا مواد اور اہانت کے نقطۂ نظر سے مرتب ہونے والا رسالہ کذب و افترا، بہتان طرازی اور دلآزاری کا مجموعہ نہیں تو اور کیا ہو گا؟

بہرصورت مسٹر سی ایچ ڈزنی مجسٹریٹ درجۂ اول نے بڑی تندہی سے فریقین کے دلائل سنے۔ اور طویل سماعت کے بعد ۱۹۲۴ء کے اواخر میں عدالت ہذا نے راجپال کو چھ ماہ قید بامشقت اور ایک ہزار روپیہ جرمانے کی سزا کا حکم سنا دیا۔ راجپال نے اس فیصلے کے خلاف سیشن کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ جس کی سماعت کرنل ایف سی نکوس نے کی۔ اس عدالت میں اسے مجرم تو قرار دیا گیا۔ تاہم مجسٹریٹ کے فیصلے میں تخفیف کر دی گئی اور سیشن جج نے ناشر مذکور کو محض چھ ماہ سزائے قید سنائی طویل مدت کی اس عدالتی کارروائی کے بعد ۱۹۲۷ء میں ملزم کی جانب سے نگرانی کی درخواست ہائی کورٹ

میں پیش ہوئی۔ جس کی سماعت کنور دلیپ سنگھ مسیح کی عدالت میں ہوئی۔ اس وقت پنجاب ہائی کورٹ کا چیف جسٹس سر شادی لال تھا۔ جس کی ذاتی سفارش پر راجپال کو رہا کر دیا گیا۔ دلیپ سنگھ جج نے اپنے فیصلے میں لکھا "کتاب کی عبارتیں کیسی ہی ناخوشگوار ہوں۔ بہر حال کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر رہیں"۔ اس فیصلے سے تمام مسلمان مشتعل ہو گئے۔ مختلف حلقوں نے تحریر و تقریر کے ذریعے اس کی شدید مذمّت کی۔ وہی دیرینہ جوش و خروش اور غیظ و غضب دلوں میں دوبارہ عود کر آیا۔ پورے ملک پر اندوہناکیوں کی فضا چھا گئی اور اہل اسلام کی جانب سے جج مذکور کی برطرفی کا مطالبہ ہوا۔ ایک ممتاز مسلمان وکیل ڈاکٹر سید عبدالمجید ایم اے ایل ایل ڈی۔ بیرسٹرایٹ لاء جو ان دنوں انگلستان میں پریکٹس کرتے تھے اپنے انٹرویو میں' اور انگریزی روزنامہ کے معزّز معاصر مسلم کرانیکل نے اس فیصلے کے خلاف ایک تنقیدی مضمون میں لکھا "جج کنور دلیپ سنگھ نے قانون کی غلط تشریح کی ہے ورنہ قانون میں اس امر کی واضح اور کافی گنجائش ہے کہ وہ راجپال جیسے دریدہ ذہن اور بے غیرت ملیچھ کا محاسبہ کرے"۔ مزید وضاحت سے لکھا گیا تھا "اس سے بڑھ کر مذہبی دلآزاری کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کا ہر مسلمان بالعموم اور برصغیر کا ہر مسلمان بالخصوص کبیدہ خاطر ہے۔ بلکہ حبیبِ کبریاؐ کی ناموس پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہے"۔ اخبار نے نکتہ چینی کرتے ہوتے انتباہ کیا کہ "مسلمان ایک زندہ اور فعال قوم ہے۔ اگر عدالت نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی نہ کی تو کوئی اخفش اس منہ زور کا سر قلم کر دے گا"۔ درج بالا نفسِ مضمون ایک انگریزی روزنامہ "مسلم آؤٹ لک" کے اداریے میں شائع ہوا۔ اس وقت انگریزی میں مسلمانوں کے جذبات اور احساسات کا ترجمان واحد یہی اخبار تھا۔

تنقیدی اداریہ طبع کرنے کے جرم میں مسلم آؤٹ لک پر توہین عدالت کا مقدمہ دائر ہوا۔ چیف ایڈیٹر سیّد دلاور شاہ اور اخبار کے مالک مولوی نور الحق کو دو دو ماہ قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ اس سلسلے میں متعدد جلسے ہوئے اور جلوس نکلے حتیٰ کہ اس موقع پر مولانا محمد علی جوہرؒ جیسی سنجیدہ شخصیّت بھی خاموش نہ رہ سکی۔ انہوں نے جو تقریر شاہی مسجد میں عوام کو مخاطب کرتے ہوتے ارشاد فرمائی۔ وہ انسانی ذہن پر ہمیشہ مرتسم رہے گی۔ انہوں نے فرمایا "میں کوئی وکیل یا بیرسٹر نہیں۔ قانون میں جو کچھ سیکھا ہے وہ بار بار ملزم کی حیثیت سے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر

سیکھا ہے ۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ آئندہ فتنے کے سدِ باب کے لیے اس قانون کو ہی بدلوا ڈالیئے اور تعزیراتِ ہند میں ایک مستقل دفعہ بڑھوا کر توہین بانیان مذاہب کو جرم قرار دیجئے ۔ اب تک ایسی کوئی مستقل سزا آپ کے ملکی قانون میں نہیں ۔ جو رعایا کے فرقوں کی دلآزاری پر دی جا سکے ۔ بعض عدالتیں جو سزا دیتی ہیں ۔ وہ محض حاکم کی رائے کا درجہ رکھتی ہیں ، مستقل قانون کا نہیں ۔ دفعہ کا مسودہ میں تیار کیے دیتا ہوں ۔ اسمبلی کے کوئی ممبر اس میں مناسب لفظی ترمیم کر کے اسے ایوان میں پیش کریں اور منظور کرائیں ۔ آقا دہا دیؐ اور ان کے ساتھ تمام دوسرے مذہبوں کے محترم بانیوں کی شخصتیں بھی بدزبان اور بے لگام لکھنے والوں کے حملوں سے محفوظ ہو جائیں گی ۔ علمی رنگ میں کسی مذہب پر یا تاریخی حیثیت سے مذہب کے بانی پر تنقید کرنا بالکل دوسری شے ہے اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہنا چاہیئے ۔ لیکن جو کھلی توہین کسی بھی مذہب کے بارے میں ہو ۔ آج سے اسے ہندوستان کے قانون میں قطعی جرم قرار دیا جانا چاہیئے ۔"

ایک مدت سے مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی ہو رہی تھی ۔ شاتمِ رسول کی یاوہ گوئیوں کی شہرت دور دور تک پھیلتی چلی گئی ۔ معاندین کا گھٹیا اندازِ فکر اسقدر اہمیت اختیار کر گیا کہ اسی دوران کابل کے مشہور اخبار " امان افغان " نے بھی " رنگیلا رسول " کے عنوان سے ایک نہایت رقت آمیز ، جگر گداز اور سبق آموز اداریہ لکھا ۔ جس میں گستاخانِ رسالتؐ کی سرزنش اور انگریز عملداری پر سخت تنقید کی گئی ۔

یہ صورتحال بے چین و مضطرب کر دینے کے لیے کافی تھی ۔ لہذا سر محمد شفیع کی قیادت میں مسلم اکابرین کے ایک وفد نے گورنر سے ملاقات کی ۔ انہیں عدالت کے اس غیر منصفانہ فیصلے سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اس سے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں ۔ گورنر نے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ان کی ڈھارس بندھائی اور وعدہ کیا کہ وہ مزید چھان بین کرائیں گے ۔ اگر کہیں سقم ہوا تو اسے حقائق کی روشنی میں فی الفور دور کرنے کی سعی کی جاتے گی ۔ اس واقعہ سے ہندو لیڈروں کی مسلم دشمنی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انہوں نے گورنر کے اس رویے کے خلاف وائسرائے ہند کو احتجاجی تار ارسال کیے اور مسلمانوں کے وفد سے گورنر کی بات چیت کو توہین عدالت قرار دیتے ہوئے عدالتِ عالیہ کے فیصلے کی حمایت کی ۔

ہندومت میں مہاتما گاندھی ایک واحد فرد تھا۔ جس نے آریہ سماج کی معاندانہ روش کی مذمت کی اور ۲۴ ستمبر ۱۹۲۷ء کو "ینگ انڈیا" میں رنگیلا رسول کے عنوان سے ایک مفصل مضمون شائع کیا اس سے قبل انہوں نے ۱۹ جون ۱۹۲۴ء کو اسی اخبار میں ستیارتھ پرکاش، رشی دیانند اور سوامی شردھانند پر تنقید کی تھی۔ اداریے کے قریب آخر میں آپ نے لکھا "پیغمبرؐ کے متعلق اس ناخواندہ رسالہ اور توہین آمیز اخبار "شیطان" پر میرے اعتراضات میرے پاس آریہ سماجیوں کے خطوط کا ایک پلندہ لے آئے۔ حالانکہ میں چاہتا ہوں کہ سماج وقت اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلے اور اپنی جھگڑالو طبیعت کو خیرباد کہہ دے اپنے عقائد و خیالات کی پابند رہے۔ لیکن دوسرے مذاہب کے ساتھ اسی رواداری کا سلوک کرے، جس کی وُہ اپنے لیے طالب ہے۔

O

جج کے اس فیصلے کے خلاف جا بجا احتجاج ہونا شروع ہو گئے۔ جس کا اظہار جلسوں اور جلوسوں کے ذریعے ہو رہا تھا۔ علاوہ ازیں مسلم اخبار بھی اس معاملے میں پیش پیش تھے۔ مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار "ہمدرد" دہلی میں لکھا "حکومت نے آرڈی ننس کے بل بوتے پر قانون کی تشکیل کا جو اختیار رکھا ہے۔ اس کا ناجائز استعمال تو اکثر ہوتا رہتا ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ کم از کم ایک مرتبہ ہی اس کا جائز استعمال کر دکھائے اور حالات میں مزید خرابی پیدا ہونے سے پہلے فوری طور پر قانونی سقم کو دور کر دے۔" اس فیصلے سے مسلمانان ہند تقاضائے انصاف سے مایوس ہو چکے تھے اور احتجاج کرنے کی خاطر سب سے بڑا معرکہ خیز جلسہ ۴ جولائی ۱۹۲۷ء کو درگاہ حضرت شاہ محمد غوث بیرون دہلی دروازہ لاہور کے پاس ہوا۔ جلسے کا انعقاد اور منادی کرنے کے سلسلے میں مہر علم الدین، محمد شفیع اور خواجہ غلام محمد کے کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں اس روز جلسے کو ناکام بنانے کی خاطر سرِ شام ہی متعدد ضلعی حکام بھی باغ میں پہنچ گئے۔ کیونکہ حکام اس سے قبل سہ پہر کے وقت لاہور میں دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کا اعلان کر چکے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے درمیان ہیجان اور اضطراب کے جذبات پیدا ہو گئے۔ ہر طرف ہنگامہ خیزیاں ہو رہی تھیں۔ ادھر ضلعی خلافت کمیٹی فیصلہ کر چکی تھی کہ جلسہ ہو گا اور ضرور ہو گا۔ فرزندانِ توحید نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے کے لیے دھڑا دھڑ اپنے نام لکھوائے۔ پنجاب خلافت کمیٹی کے دفتر میں طویل بحث و تمحیص کے بعد قرار پایا کہ شاہ محمد غوث کی درگاہ کے بالمقابل احاطہ

شیخ عبدالرحیم میں جلسہ قرار پائے چنانچہ احاطہ عالیشان سول ۱م سے کھچا کھچ بھر گیا۔ جلسے میں مفتی کفایت اللہ، مولانا ظفر علی خاں، غازی عبدالرحمان مولانا سعید دہلوی، سر عبدالقادر اور ان کے علاوہ متعدد علمائے کرام بھی شریک تھے۔ چودھری افضل حق صاحب رکن کونسل لدھیانہ صدر جلسہ قرار پائے۔ چودھری مذکور نے افتتاحی تقریر میں مقامی حکام کی اس شدید غلطی کا بوضاحت تذکرہ کیا "کہ ایک جج نے تو قانون کو مذہب سے ٹکرا دیا تھا۔ لیکن مسٹر اوگلوی نے ناعاقبت اندیشی سے سیاست کا مذہب سے تصادم کرا دیا ہے۔ یہ وہ شدید غلطی ہے۔ جس پر حکام کو پریشان ہونا پڑے گا۔" اس کے بعد مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے مختصراً جسٹس دلیپ سنگھ کے فیصلے پر نکتہ چینی کی اور پھر امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک رقت انگیز تقریر ارشاد فرمائی۔ آپ نے کہا "آج کوئی روحانیت کی آنکھ سے دیکھنے والا ہو تو دیکھ سکتا ہے کہ حضرت رسولِ اکرم اور ان کی ازواجِ مطہرات ہم مسلمانوں کی مائیں لاہور کے مسلمانوں سے فریاد کر رہی ہیں کہ تمہارے شہر میں ہماری بے حرمتی کی جا رہی ہے۔ ہمیں کھلے بندوں گالیاں دی جاتی ہیں۔ اگر کچھ پاسِ رسالت ہے تو ناموسِ رسالت کی حفاظت کرو!"

پہلے ہی ایک رقت کا عالم طاری تھا اور حاضرینِ جلسہ زار و قطار رو رہے تھے۔ بعض جوشیلے نوجوان زور و شور سے یہ تقاضا کر رہے تھے کہ ہم ممنوعہ جلسہ گاہ میں ظالم حکومت کے بازوؤں کو آزمانا چاہتے ہیں۔ اسی دوران حکام کی مداخلت اور فدایانِ رسول زدوکوب کیے جانے کی وجہ سے تقریر روک دینا پڑی اس وقت حاضرین کی تعداد محتاط اندازے کے مطابق ۳۰ ہزار سے زائد ہو چکی تھی۔ رات نو بجے کے بعد باقاعدہ جلسے کا آغاز ہوا۔ جس کا افتتاح خواجہ عبدالرحیم عاجز امرتسری نے ایک ولولہ انگیز پنجابی نظم سے کیا۔ اس کے بعد اختر علی خاں نے نظم پڑھی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے خطبہ مسنونہ کے بعد سورۃ القمان کی ابتدائی آیات کی تلاوت فرمائی۔ آپ کی تقریر کیا تھی؟ الفاظ کے تیر تھے جو دل میں ترازو ہوتے جا رہے تھے۔ وہ الفاظ کیا تھے؟ شعلہ نوائیوں کا ایک سامان تھا۔ جس سے مصلحت کوشیاں خاکستر ہو رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا "آج ہم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ خداوند کریم ہمیں توفیق دے۔" اس کے بعد مولانا نے حضور سرورِ کائنات صلعم کی شان میں ایک نعتیہ بند اس انداز سے پڑھا کہ حاضرین کے دل گداز ہو گئے اور مجمع پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آپ نے کہا "آج مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مرتضیٰ حسن، مولانا احمد سعید دہلوی اور مفتی کفایت اللہ یہاں

تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ان کے دروازے پر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ ڈیپوٹیشن (قرارداد) لے کر گئیں اور فرمایا۔ ہم امہات المومنین ہیں۔ تمہاری اور سب مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ آج ہمیں بازاروں میں گالیاں دی جاتی ہیں۔ کیا تمہاری غیرت جوش میں نہیں آتی؟

مسلمانو! تمہارے دروازے پر بی بی عائشہ رضؓ دستک دے رہی ہیں۔ اٹھو گناہ بخشوانے کا وقت آج ہی ہے (حاضرین زاروقطار رو رہے تھے) آج بڑے بڑے بیرسٹر کام نہیں آسکتے آج نامی گرامی لیڈر کام نہیں آسکتے۔ آج یہی داڑھی منڈے کام آئیں گے جو یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ دوستوں کی محبت میں کٹ مرتے ہیں۔ آج سبز گنبد کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تڑپ رہے ہیں ان کی ازواجِ مطہرات یعنی ہماری ماؤں کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کیا ہمارا ایمان اس قدر کمزور ہے کہ بازاری عورتوں اور معشوقوں کے لیے تو مرمٹیں۔ مگر عائشہ رضؓ اور خدیجہ رضؓ کی عزت پر حملہ ہو تو ہم یوں ہی خاموش بیٹھے رہیں۔ اگر آج ہم ان کی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتے تو اس سے بہتر ہے کہ ہم پلیگ، ہیضہ یا کسی وبا کا شکار ہو جائیں۔

آج گورنمنٹ نے ہمارا جلسہ روکنے کے لیے پامال زمین پر قبضہ تو کر لیا۔ لیکن وہ دلیپ سنگھ کے قلم پر قابض نہ ہو سکی۔ ملاپ اور پرتاب کے ایڈیٹروں کو بس میں نہ کر سکی۔ ہم نے تین سال تک جبر کیا۔ لیکن ہندو اسے نہ سمجھ سکے۔ وہ یاد رکھیں۔ جب تک ایک ایک مسلمان بھی زندہ ہے۔ ناموسِ رسالت رسولِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر حملہ کرنے والے چین سے نہیں رہ سکتے۔ پولیس جھوٹی ہے۔ حکومت کوڑھی ہے اور ڈپٹی کمشنر نااہل ہے۔ وہ ہندو اخبارات کے سنڈے ایڈیشنوں کی ہرزہ سرائی کو تو نہیں روک سکتا۔ لیکن علمائے کرام کی تقریریں روک دیتا ہے۔ میں دفعہ ۱۴۴ کو جوتے کے نیچے مسل کر بتا دوں گا۔

پڑا فلک کو کبھی دِل جلوں سے کام نہیں
جلا کے راکھ نہ کر دوں تو داغ نام نہیں۔

تقریر کو جاری رکھتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا ” وقت آگیا ہے کہ دفعہ ۱۴۴ کے پرخچے یہیں اڑا دیئے جائیں۔ بیس بیس مسلمانوں کے دستے ممنوعہ جلسہ گاہ میں جائیں اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام پر جو مصیبت بھی پیش آئے۔ بطیبِ خاطر جھیلیں اور اپنی زندگیاں حرمتِ رسولؐ پر نثار کر دیں مجھے اطلاع ملی ہے کہ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ نے لوگوں کو ہنٹر مارے ہیں۔ یہ کیسی بزدلی ہے۔ جو شخص اس

قدر بزدل ہو۔ وہ شہر کا انتظام کس طرح چلا سکتا ہے"۔

رات گئے جب اس جلسے کا اختتام ہوا تو سننے والوں نے سنا اور دیکھنے والوں نے دیکھا دفعہ ۱۴۴ کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھری نظر آتی تھیں اور اس کے ساتھ ہی شاتمِ رسول کی زندگی کے دن پورے ہو رہے تھے۔

جلسے کے چند دن بعد شاہ صاحب، غازی عبدالرحمان اور مولانا حبیب الرحمان گرفتار کر لیے گئے۔ ان پر نقضِ امن عامہ کے تحت مقدمہ دائر ہوا۔ بعدازاں امرتسر سے رضا کار ٹولیوں کی صورت میں لاہور آتے رہے اور گرفتاریاں ہوتی رہیں۔ الغرض جب تک وہ اشتعال انگیز کتاب موجود تھی مسلمانوں کے انتقامی شعلوں کا فرو ہونا محال تھا۔

فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کی بنا پر ان دنوں "ورتمان" کے ایڈیٹر کے خلاف بھی دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت مقدمہ چل رہا تھا۔ حکومت کی دلچسپی پر اس مرتبہ یہ مقدمہ مجسٹریٹ کی عدالت سے منتقل ہو کر ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ کے سپرد ہوا۔ جس کے صدر جسٹس براڈوے تھے۔ ڈویژن بنچ نے کنور دلیپ سنگھ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے متفقہ فیصلے میں لکھا " دفعہ ۱۵۳ الف ایسے لٹریچر پر حاوی ہے جو فرقہ وارانہ فساد پھیلائے۔ یا مذہبی دلآزاری کا سبب بنے"۔

اس مقدمے کا مجرم تو اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ بعد میں مولانا محمد علی جوہرؒ کی تحریک اور مرکزی اسمبلی کے مسلمان ارکان کی تائید سے گستاخ اہل قلم کے احتساب کی خاطر ضابطۂ تعزیرات ہند میں دفعہ ۲۹۵ الف کا اضافہ بھی ہو گیا۔ لیکن شاتمِ رسول راجپال بری ہو چکا تھا اور قانون کی اس متلوّن مزاجی پر ہنس رہا تھا۔

کون مسلمان کون کافر؟

فلسفۂ ایمان قرآن و حدیث کی روشنی میں
عشق و محبت کے تاریخی افسانے۔
کیا ہم بھی مسلمان ہیں؟

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

"اگر تو میری بات کو سمجھے اور اس فلسفے پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی آنکھوں سے نظر ڈالے تو دل و جگر کی تمام تر قوت سیّد المرسلین پر قربان ہوا چاہتی ہے اور محبوبؐ خدا کی ذاتِ اقدس خدا سے بھی زیادہ پیاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہم نے خدائے عزّوجل کو آپ کے ذریعے سے ہی پہچانا ہے"

نبی کریمؐ ہمیشہ سے مومن نگاہوں کا مرکز ہیں۔ آپ کا فکر و تصوّر اہلِ عشق کی نماز اور درود و سلام کا وِرد افضل ترین عبادت ہے۔ ہر مسلمان کا دل آپ کی عقیدت و محبّت کا مسکن ہے۔ قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے "مسلمانوں کو اپنے نبیؐ کے ساتھ اپنی جانوں سے زیادہ محبت رکھنی چاہیئے اور ازواجِ مطہرات مسلمانوں کی مائیں ہیں"۔ ایک اور جگہ حکم ہوتا ہے "اگر اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو نبی اکرمؐ کی اطاعت کرو!" اس آیہ کی تفسیر میں حدیث کے یہ الفاظ ہیں لایومن أحدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین۔ کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ رحمۃ العالمینؐ کو اپنے والدین، اپنی اولاد، اپنی جان اور دیگر تمام دنیا سے زیادہ عزیز نہ رکھے۔ عشق و محبت اور الفت و ارادت کی یہ ایک طویل داستان ہے۔ اسلام کے پہلے شہید حضرت حارثؓ بن ابی ہالہ ہیں۔ جنہوں نے کعبۃ المعلیٰ میں امام الانبیاءؐ کو کفارِ مکہ سے بچانے کے لیئے اپنی جان نذر کر دی اور جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ حارثؓ شہیدِ اوّل ہے۔ جن کی روح بغیر حساب کے جنت الفردوس میں داخل ہو گی۔

عشاقِ حقیقی کا کئی بار امتحان ہوا ہے۔ کبھی کسی کو جلتی دھوپ میں لٹا کر چھاتی پہ پتھر رکھ دیے گئے کہ کروٹ نہ بدل سکے۔ لوہا گرم کر کے اس سے بدن کو داغتے۔ کوئلے جلا کر زمین پہ بچھا دیتے اور عاشقانِ رسولؐ کو دہکتے انگاروں کی سیج پر چت لٹا دیتے۔ کسی کے پاؤں میں رسی ڈال کر کھچوائی گئی۔ بعض کو تپتی ہوئی زمین پہ ننگا لٹا کر اوپر سے کانٹوں والی شاخیں ماری گئیں۔ قصہ کوتاہ عشقِ محمدؐ کی وجہ سے مشرکین نے شمعِ رسالتؐ کے پروانوں کو ظلم و جور کا تختۂ مشق بنائے رکھا۔ مگر ان کی استقامت میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔

حضرت زیدؓ سرورِ کل جہاںؐ کے مداح تھے۔ ایک دفعہ وہ مشرکین کی قید میں آ گئے۔ جنہوں نے آپ کو برسرِ عام شہید کر دینے کا اعلان کیا اور دیرینہ عربی روایات کے مطابق پوچھا کہ تمہاری زندگی کا خاتمہ کس طرح کیا جائے۔ آپ نے بہ ہزار اطمینان فرمایا "یوں تو ہر انسان فانی ہے۔ مگر حرمتِ رسولِ اقدسؐ پر کٹ مرنا حیاتِ جاودانی ہے۔ ایسی موت میرے لیے خوشیوں کا پیغام ہے۔ آپ جس طرح چاہیں، میری روح کو اس تنِ خاکی سے آزاد کریں۔

البتہ شہادت کا یہ بلند رتبہ عطا ہونے پر مجھے دو رکعت نماز بطور شکرانہ ادا کرنے کی اجازت دی جائے۔" چنانچہ نماز ختم ہوتے ہی آپنے بصد اشتیاق خود کو شہادت کے لیے پیش کر دیا اور کفار نے آپکو تڑپا تڑپا کر شہید کیا۔ مگر آپ ہر وار پر بصد ناز و فخر درود و سلام کا ورد کرتے رہے اس ایمان پرور واقعہ کو مولانا ظفر علی خان نے بھی ایک روح افزا انداز سے منظم کیا ہے۔

عشق و مستی میں ڈوبی ہوئی حضرت بلالؓ کی اذان اور ان کا عشق مصطفیٰؐ افسانہ نہیں۔ مگر افسانے سے زیادہ حسین اور زوردار ہے۔ حضرت خبیبؓ کا موت کی آغوش میں رقص و تبسم بھی کتاب عشق کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ حضرت عثمانؓ، ابوذرؓ، زبیرؓ، سعیدؓ بن زید، اور سعدؓ بن وقاص کو حضور علیہ السلام پر ایمان لانے کی وجہ سے طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں۔ مگر بقول شبلی نعمانی "یہ تمام مظالم، یہ جلادانہ بے رحمیاں، یہ عبرت خیز سفاکیاں ایک مسلمان کو بھی راہ حق سے متزلزل نہ کر سکیں۔" ایک نصرانی مورخ نے پالوجی کا ڈوفری ہگینس (ترجمہ اردو مطبوعہ بریلی) میں نہایت سچ کہا ہے "کہ عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مسائل نے وہ درجہ نشہ دینی کا آپ کے پیرووں میں پیدا کیا۔ جس کو حضرت عیسیٰؑ کے ابتدائی پیرووں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کو سولی پہ لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے۔ ان کا نشہ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجے میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے۔ برعکس اس کے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا۔"

غزوہ بدر حق و باطل کا وہ پہلا معرکہ ہے۔ جس میں مٹھی بھر مسلمان کثیر تعداد کفار کے مقابل صف آرا ہوئے اور خدا کی راہ میں اپنی جانیں قربان کیں اس کے بعد بھی سینۂ ارض پر ایسے کئی خونریز معرکے ہوئے جن میں مسلمانوں نے اپنے مقدس خون سے حرمت رسول عربی اور تحفظ حرم کا فریضہ ادا کیا۔

معرکۂ کربلا عشق و محبت کی ایک ایسی کتاب ہے جس کا ورق ورق خود اپنی مثال آپ ہے، خیر الانامؐ کی ذات پاک سے ارادت کیشی کی شدت اس واقعہ سے بھی عیاں ہوتی ہے کہ جب غزوہ احد میں سید الرسلؐ کا دانت مبارک شہید ہوا تو حضرت اویسؓ قرنی نے فقط اتباع مصطفیٰؐ کے جذبے

سے اپنے تمام دانت توڑ ڈالے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے بھی ایک مرتبہ فرطِ عقیدت سے فرمایا: "مجھے محبوبِ خدا خود خدا سے بھی زیادہ محبوب ہیں"۔ اس مضمون کو حکیم الامت ڈاکٹر اقبال رحؒ نے یوں بیان کیا ہے ؎

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر — بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ — از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

یعنی "اگر تو میری بات کو سمجھے اور اس فلسفے پر حضرت ابوبکر رضؓ کی آنکھوں سے نظر ڈالے تو دل و جگر کی تمام تر قوت سید المرسلینؐ پر قربان ہوا چاہتی ہے اور محبوبِ خدا کی ذاتِ اقدس خدا سے بھی زیادہ پیاری ہو جاتی ہے"۔ کیونکہ ہم نے خدائے عزّ و جل کو آپؐ کے ذریعے سے ہی پہچانا ہے۔

ہم کتابِ عشق کے جس باب کا بھی مطالعہ کریں اس کا ایک ایک ورق ازحد ایمان افزا ہے۔ روایت ہے ایک نام نہاد مسلمان اور یہودی کی کسی کاروباری معاملے میں نزاع ہوگئی۔ ان دونوں میں طے پایا کہ اس اختلاف کا فیصلہ سرکارِ دوعالم سے کرا لیا جائے۔ وہ دونوں دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے اور اپنی آمد کا مدعا عرض کیا۔ یہودی اپنے موقف میں سچّا تھا۔ چنانچہ مولائے کائناتؐ نے اس کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا۔ بعد ازاں کم بخت منافق نے حضرت فاروقِ اعظم رضؓ سے فیصلہ کرانا چاہا اور وہ کشاں کشاں ابن خطاب کے روبرو پیش ہوئے۔ جب حضرت عمر رضؓ کو تمام حالات کا علم ہوا تو آپ نے تلوار کھینچ لی اور اس نام نہاد مسلمان کا سر تن سے جدا کر کے فرمایا "جو رسول اللہؐ کے فیصلے سے انحراف کرے۔ وہ اسی فیصلے کا مستحق ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ عاشقانِ رسولؐ کی عقیدت سے دشمن بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک سفیر کی رُوداد کا یہ تذکرہ مخالف مولفین کے قلم سے بھی بے اختیارانہ نکل کر بروئے کاغذ آگیا ہے "میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں۔ یہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی۔ محمد بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے۔ کوئی شخص ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔ وہ وضو کرتے ہیں تو جو پانی گرتا ہے اس پر خلقت ٹوٹ پڑتی ہے۔ تھوک گرتا ہے تو عقیدت کیش ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور چہرہ اور ہاتھوں پہ مل لیتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ کمینوں کی طرح ان کی جوتیاں جھاڑتے ہیں"۔

شاتمِ رسول کا قتل جائز بلکہ فریض ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضؓ کو اپنی خلافت کے دوران میں اطلاع

ملی کہ آپ کے ماتحت ایک والی نے ایک عورت کے دانت اکھیڑ دیے ہیں۔ کیونکہ اس عورت نے حضور علیہ السلام کی شان میں ناروا کلمات بکے تھے۔ آپ نے فرمایا "اب سزا دی جا چکی ہے۔ ورنہ میں حکم دیتا کہ عورت کو قتل کر دیا جائے۔ اس لیے کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شان میں گستاخی سے پیش آئے۔ اس کی سزا قتل ہے"۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح (جنہیں اہل حدیث اپنا مقتدا مانتے ہیں) ایک کتاب 'الصارم المسلول علی شاتم الرسول' لکھ گئے ہیں۔ جس میں وہ فرماتے ہیں (ترجمہ) "اللہ اور رسول کی حرمت کی جہت ایک ہے۔ جس نے حضور کو ایذا دی۔ اس نے گویا اللہ کو تکلیف دی اور جس نے حضور کی اطاعت کی۔ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ کیونکہ امت بلا واسطہ رسول، اس چیز کو نہیں پہنچ سکتی جو اللہ اور بندوں کے درمیان ہے۔ سوائے رسول اللہ کے، امت کے لیے کوئی سبیل اور واسطہ نہیں ہے تحقیق اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنا قائم مقام کیا ہے۔ تمام اوامر و نواہی ہیں۔ اپنی خبر دیتے ہیں اور بیان ہیں۔ اور ان امور میں اللہ اور رسول کے درمیان فرق کرنا جائز نہیں"۔ شیخ الاسلام پھر فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو برا کہنے والا مرتد سے زیادہ مجرم ہے۔ اس جرم میں کعب بن اشرف یہودی، ابن خطل (باوجود کعبہ میں پناہ لینے کے) ابی رافع یہودی، ابوجہل وغیرہ قتل کیے گئے۔ حضور کی عزت و توقیر ہم پر اللہ نے فرض کر دی ہے حضور کی مدح، آپ کی تعظیم اور محبت، ایمان کے لیے لازم ہے۔ آپ کی تعظیم اور ثنا کا قیام دین کا قیام ہے۔ حضور کی شان میں گستاخانہ کلام کرنا امت کے لئے جائز نہیں۔ اگر گستاخی کنندہ مسلمان ہو تو اس کے توبہ کرنے پر بھی سزائے قتل ساقط نہیں ہوگی"۔ پھر آپ امام مالک علیہ الرحمتہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں "جو کوئی حقارتاً کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی چادر کیسی میلی تھی یا آپ کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے۔ جس سے تحقیر کا پہلو نکلتا ہو تو وہ بدگوؤں میں شمار ہوگا"۔ دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ایک نے کہا کہ "تم امّی (ان پڑھ) ہو"۔ اس نے کہا "امّی تو حضور بھی تھے"۔ اس پر امام مالک رح نے اس کے قتل کا فتویٰ صادر فرما دیا۔

قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ شفا شریف میں رقم فرماتے ہیں "جو شخص نبی آخر الزمان کی نعلین مبارک (جوتی) کو تحقیراً جوتڑا کہہ دے وہ واجب القتل ہے"۔ اس مؤقف کی تائید تاریخ اسلام

کے اس زریں واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ حضور اکرمؐ کے ایک صحابی بینائی سے محروم تھے ان کی بیوی یہودن تھی اور وہ پیغمبرِ اسلام کی ذاتِ بابرکات سے عنادِ قلبی رکھتی تھی۔ ایک دن وہ صحابی خلافِ معمول ذرا دیر سے گھر پہنچے تو بیوی کے استفسار پہ بتایا کہ میں ہادیٔ برحق کی پند و نصائح سے مستفیض ہوتا رہا ہوں۔ یہ سن کر وہ کافرہ آگ بگولا ہو گئی اور آقا و مولاؐ کی شان میں نازیبا کلمات بکنے لگی۔ صحابی نے اسے دو ایک بار منع کیا۔ مگر وہ باز نہ آئی۔ اس پہ غیور جاں نثار نے دنیوی مصلحتیں بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے واصل فی النار کر دیا۔ جب مقتولہ کے وارثوں نے یہ مقدمہ خیر الوریٰؐ کی عدالت میں پیش کیا تو قاتل نے اقبالِ فعل کیا اور کہا کہ مقتولہ نے میرے مذہبی عقائد و جذبات کو مجروح کیا تھا۔ اس پر مولائے کلؐ نے اس صحابی کو غازی کا خطاب بخشا اور اس کی تعریف و توصیف فرمائی۔

حضرت علیؓ کی جان نثاری تاریخِ اسلام کا سنہری باب ہے۔ پیر غلام دستگیر نامی کے الفاظ میں "کفارِ مکہ حضور سرورِ کونینؐ کے درپے آزار ہیں اور چاہتے ہیں کہ حضورؐ کو قتل کر دیں۔ حضورؐ ہجرت کا ارادہ فرماتے ہیں۔ کفار لمحہ لمحہ کی خبر رکھتے ہیں۔ لہذا یہ خیال دامن گیر ہے۔ اگر کفار نے حضورؐ کا بستر خالی پایا تو وہ فوراً حضور کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ حضورؐ کا کوئی فدائی حضور کے بستر پہ سو جائے۔ تاکہ کفار یہی سمجھیں کہ حضورؐ بستر پہ استراحت فرما رہے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جو شخص حضورؐ کے بستر پہ سوئے گا۔ اس کے لیے حقیقتِ حال کھل جانے کے بعد کفار سے جان چھڑانا مشکل ہو گا۔ اس نتیجے کے باوجود حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ عواقب سے بے نیاز ہو کر کمال دلجمعی کے ساتھ حضورؐ کے بستر پر لیٹ جاتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دوسرے فدائی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ساتھ لے کر مکہ سے نکل جاتے ہیں۔"

مولانا رومؒ کی شہرتِ دوام بھی عشقِ رسولؐ کے طفیل ہے یہ شعر جو خلاصہ دین و ایمان ہے ان کے رشحاتِ قلم کی صحیح تفسیر ہے ؎

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

حضرت جامیؒ کی زندگیٔ جاوید کا سبب بھی یہی تڑپ ہے۔ یہ تڑپ دراصل مومن کی متاعِ حیات ہے

یہ متاعِ حیات ہی ایمان اور حقیقی دین ہے۔ عشق کی تڑپ ان کے خون میں بھی سرایت کرگئی تھی۔ تب ہی تو وہ فرماتے ہیں ؎

یک قطرہ از خونِ جامیؔ چوں بدریا افگنی
جگرِ سوزاں، دلِ تاباں ماہی زِ آب آید بیروں

یہی وہ عشق ہے۔ جس نے بلال حبشیؓ کو مسلمانوں کا سردار بنایا۔ زیدؓ و خبیبؓ کا نام روشن کیا اسی عشق نے ابوبکرؓ کو صدیق اکبر کا خطاب دلایا۔ عمرؓ کو فاروق اعظمؓ بنا دیا۔ خلیفۂ ثالث کو غنی کا خطاب بخشا اور امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰؓ کو اسد اللہ کا شرف عطا ہوا۔

آمدم بر سرِ موضوع اسلام ایک امن پسند مذہب ہے۔ وہ خود زندہ رہنا چاہتا ہے اور دوسروں کو بھی زندہ رہنے کا حق دیتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے دیگر بانیانِ مذاہب کو بُرا بھلا کہنے سے سختی کے ساتھ منع فرما دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "کسی فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دین کے پیشوا پر بہتان باندھے۔ مبادا کہ وہ مشتعل ہو کر خود اس کے پیغمبر کی تحقیر کریں"۔ اس لئے مومن کی صفت یہ ہے وہ خود کسی مذہبی پیشوا کے خلاف زبان درازی کرتا ہے۔ نہ اپنے دین کی توہین برداشت کرسکتا ہے۔ بلکہ ہر ذی ایمان حرمتِ رسولؐ کے تحفظ کی خاطر اپنی زندگی نچھاور کرنے کا ہمیشہ آرزومند رہتا ہے۔ سچے مسلمان کی پہچان یہ ہے وہ کسی بھی صورت میں اپنے آقا و مولاؐ کی تضحیک و توہین برداشت نہیں کرسکتا۔ مسلمانوں میں گو پہلی سی بات نہیں۔ یہ اعمال میں بہت کمزور ہو گئے ہیں اور قرونِ اولیٰ کے باعمل دینداروں کی سی حرارتِ دینی ان میں موجود نہیں رہی۔

تاہم رسول اللہ کی محبت ابھی ان کے دلوں میں باقی ہے جہاں کوئی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف منہ سے بے ادبانہ کلمہ نکالتا ہے مسلمان بیتابانہ تڑپ اٹھتے ہیں اور جب تک شاتمِ رسول کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچا لیتے انہیں چین نہیں آتا۔ اس صدی کے ربع اوّل میں مسلمانانِ ہند کے عشق کی آزمائش بار بار ہوئی۔ جس میں وہ ہمیشہ کامیاب و کامران ہوتے رہے ہیں۔ ایسا ہی ایک بہت بڑا امتحان شاتمِ رسول راجپال کی صورت میں پیش آیا۔

مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ عشقِ رسالت میں ایک مخصوص مقام پر فائز تھے۔ اس سلسلے میں برصغیر کے مسلمانوں پر ان کا ایک عظیم احسان ہے۔ انہوں نے دینِ متین کے اس نظریے کو باور کرایا کہ رسولِ عربیؐ آقائے مکیؐ و مدنیؐ سے والہانہ عقیدت ہی اسلام کی حقیقی روح ہے۔

راجپال کے گریبان تک پہنچا ہاتھ

- مہاشہ راجپال بری ہونے کے بعد
- آنکھوں کے سامنے موت ناچتی ہے۔
- غازی خدا بخشؒ عدالت کے کٹہرے میں۔

○

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ جو ہمیں دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

"میں مسلمان ہوں۔ ناموسِ رسالتؐ کا تحفظ میرا فرض ہے۔ میں تاجدارِ مدینہؐ کی توہین ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ "رنگیلا رسول" کا لفظ منہ سے نکال رہا ہے میں اس کی زبان بند کرنا چاہتا ہوں۔"

راجپال ایک زیرک ہندو تھا۔ اس نے ہائی کورٹ سے بری ہونے کے بعد ایک نیا پینترا بدلا اور اعلان مشتہر کرایا کہ میں آئندہ اس رسالے کو شائع نہیں کروں گا مگر اسی دوران وہ پرہزل کتاب دوبارہ بنام سے شائع ہوئی۔ اس ناپاک جسارت کا ارتکاب بھی بالواسطہ خود راجپال نے ہی کیا تھا۔ اس کا نام ان دنوں عریاں تصویروں کے ایک پمفلٹ "بلیدان چیتر اولی" کے سلسلے میں بھی سنا گیا۔ جو کلکتہ سے شائع ہوا اور اسے مشاہیر اسلام سے منسوب کیا گیا۔ علاوہ ازیں ایک اور کتاب "چودہویں صدی کا چاند" اس کے زیر طبع تھی۔ جس میں مسلم ائمہ کرام پر کیچڑ اچھالا گیا تھا۔ مسلمانوں کے جذبات ایک طویل مدّت سے کھول رہے تھے۔ مگر غیظ و غضب کے طوفان کی سرکش موجیں ابھی ساحل کی پابند تھیں۔ مگر جب رستے ہوئے زخموں کو کسی جراح سے کوئی مرہم نہ مل سکا تو زخم خود ہی درمان کی تلاش کرنے لگے۔ انجمن خدّام الدین نے شیرانوالہ دروازہ میں راجپال کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔ اور امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رح کی للکار بالآخر اس کے لیے زہر قاتل ثابت ہوئی۔

چنانچہ اس سلسلے میں ایک غیور مسلمان خدا بخش کا نام قابلِ ذکر ہے۔ جس نے سب سے پہلے شاتمِ رسول پر قاتلانہ حملہ کیا۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۲۷ء کی صبح راجپال حسبِ معمول اپنی دکان پر کاروبار میں مشغول تھا۔ خدا بخش نامی ایک شخص نے اپنے تیز دھار چاقو سے اس پر حملہ کر دیا۔ جس سے راجپال کو کل چار زخم آئے جن میں ایک تو خاصا گہرا تھا۔ لیکن یہ زخم جان لیوا ثابت نہ ہوئے۔ شاید قدرت کو کسی اور کا امتحان بھی مقصود تھا۔

"کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے؟"

غازی خدا بخش اکوجہا اندرون یکی گیٹ لاہور کا رہنے والا تھا۔ باپ کا نام محمد اکبر اور اس کا تعلق ایک معروف کشمیری خاندان سے تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ شیر فروش تھا اور جلد سازی کا کام بھی کیا کرتا۔ اس جانباز کا سینہ نورِ ایمان سے منوّر اور دل آقائے دوجہاں کی محبت و ارادت سے معمور تھا۔ اس نے جمعہ کے دن ایک مسجد ناموس رسالت کے موضوع پر تقریر سنی اور راجپال کا کام تمام کرنے کے لیے بے قرار رہنے لگا۔ مگر جب موقع ملا تو شومئی قسمت کہ اس کا حملہ ناکام رہا اور راجپال کی جان بچ گئی۔

اس موقع پر پرتاب اور بندے ماترم نے خاص ضمیمے شائع کیے اور بڑی بڑی سرخیاں جمائیں۔

ہندو سبھا کے اخبار "ہندوستان ٹائمز" نے اپنے اداریے میں لکھا: "مولاناؤں اور مولویوں نے راجپال کو رنگیلا رسول کی قیمت اپنے خون سے ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ اسلام کے اس قانون پر باقاعدہ عمل کیا گیا۔ جس کی تشریح مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں کر رہے تھے" "ارجن" نے لکھا "اس حادثہ سے گورنمنٹ کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور ایسے واقعات آریہ سماجیوں کو اپنے فرائض کی بجا آوری سے باز نہیں رکھ سکیں گے" اس واردات کے فوراً بعد حکومت نے دفعہ ۱۴۴ کے اندر حصولِ اجازت خاص کے بغیر دو ماہ کے لیے عام اجتماع پر پابندی عائد کر دی۔

غازی خدا بخش کا جسم فربہ، رنگ گورا، قد لمبا اور کاٹھی مضبوط تھی۔ گرفتاری کے وقت وہ ترکی ٹوپی، کھلا کوٹ، بنگالی قمیض اور علی گڑھ فیشن کا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس وقت انکی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جبکہ مجروح راجپال چالیس کے قریب تھا۔ واردات کے دوسرے دن ہی سی ایم جی اوگلوی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں زیر دفعہ ۳۰۷ تعزیرات ہند مقدمے کی سماعت شروع ہو گئی۔ رائے صاحب مہتہ ایشر داس کورٹ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ استغاثے کی طرف سے پیروکار تھے لیکن غازی خدا بخش کی طرف سے کوئی وکیل حاضر عدالت نہ ہوا تھا۔ چشم دید اور رسمی گواہوں کی شہادتیں قلمبند ہوئیں جس کے بعد مضروب راجپال ولد رام داس نے اپنے بیان میں کہا: "سوا ساڑھے آٹھ بجے صبح کا واقعہ ہے۔ میں دکان کے اندر کام کر رہا تھا۔ باہر سے میرے ملازم نے آواز دی کہ سوامی جی بلا رہے ہیں۔ میں باہر نکل آیا اور اپنے دوست کے ساتھ گفتگو میں محو ہو گیا۔ کہ ملزم نے اچانک میرے قریب آ کر میری چھاتی پر چاقو سے حملہ کیا۔ جب اس نے چاقو مارا تو میں پیچھے تھا۔ مجھے چاقو لگا اور خون جاری ہو گیا۔ ملزم نے مجھے دھکیل کر اندر کر دیا جس وقت میں دوسرے حصہ دوکان میں پہنچا تو گر گیا اور ملزم میرے اوپر چڑھ گیا میں اپنی چھاتی کو چاقو کے حملے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سوامی سوتنتر انند کے پہنچنے سے پہلے ملزم نے مجھ پر چھ زخم لگائے" مضروب راجپال نے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میری رائے میں مجھ پر حملہ کتاب "رنگیلا رسول" کی اشاعت اور مسلمانوں کے ایجی ٹیشن کا نتیجہ ہے۔ میں نے کتاب شائع کی ہے اس کتاب کے متعلق مجھے مقدمہ میں سزا ہوئی تھی اور بعد ازاں ہائی کورٹ سے بری کر دیا گیا۔ مجھے ملزم سے اب بھی خطرہ ہے کہ یہ مجھے مار دے گا۔ حملے کے وقت بھی ملزم کہے جاتا تھا کہ کافر تو آج میرے

ہاتھ آیا ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

جب عدالت نے غدا بخش اکو جہلے سے دریافت کیا کہ وہ جرح کے طور پر کوئی سوال کرنا چاہتا ہے تو آپ نے بلند آواز سے کہا "میں مسلمان ہوں، ناموسِ رسالت کا تحفظ میرا فرض ہے۔ میں تاجدارِ مدینہ کی توہین ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ (گواہ) رنگیلا رسول کا لفظ منہ سے نکال رہا ہے میں اس کی زبان بند کرنا چاہتا ہوں۔"

لفظ پھر لفظ میں جذبوں کو سمیٹیں کیونکر
لے کر پاؤں میں اظہارِ عقیدت تجھ سے

ایک دو دن کی اس مختصر کارروائی کے بعد عدالت نے ملزم کو سات سال قید سخت جس میں تین ماہ کی قیدِ تنہائی بھی شامل تھی۔ سزا کا حکم سنا دیا۔ اور مجسٹریٹ نے اپنے فیصلے میں مزید لکھا کہ میعادِ قید کے بعد ملزم کو پانچ ہزار روپے کی تین ضمانتیں حفظِ امن زیرِ دفعہ ۱۰۴ ضابطہ فوجداری داخل کرنا ہوں گی اگر مجرم ضمانت نہ دے سکا تو اسے ایک سال مزید قید محض بھگتنی پڑے گی۔

اس فیصلے سے ہندوؤں کے خیالات میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ راجپال کے زخم مندمل ہونا شروع ہوئے اور چند روز میں بھر گئے۔ لیکن اہلِ اسلام کے جذبات میں نیا جوش اور نئی طغیانی عود کر آئی۔ اور نیم مندمل زخم پھر سے ہرے ہونے لگے۔

راجپال کے گریبان تک دُوسرا ہاتھ

- ایک اجنبی مسلمان لاہور کے گلی کوچوں میں۔
- دھوتی پوش مہاشہ کی شامت۔
- غازی عبدالعزیزؒ جیل کی کوٹھڑی میں۔

⊙

میں گونجتا ہی رہا جسم کے بیابان میں
وہ نغمہ ہوں کہ جسے پیکرِ صدا نہ ملا

"مجھے خواب میں سلطان محمود غزنوی رح نے حکم دیا تھا کہ جاؤ اور اس ملعون شاتم کے پرخچے اڑا کر ثوابِ دارین حاصل کرو! چنانچہ میں اسی جذبے سے شاہدرہ لاہور پہنچا۔ میرے نزدیک سگِ زرد بھی برادرِ شغال ہوتا ہے۔"

غازی خدا بخش اکو جہا کو سات سال قیدِ سخت کی سزا مل چکی تھی ۔ اس کا مطلب یہ تھا نبی کریم کی توہین نعوذ باللہ کوئی جرم نہیں۔ البتہ ناموسِ رسالت کا تحفظ قانون کی نگاہ میں ایک جرم ہے چنانچہ چند روز بعد ۹ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو شام کو ہسپتال روڈ پر ایک بار پھر ہنگامہ ہوا ۔ اس بار حملہ آور عبدالعزیز نامی ایک غیور مسلمان تھا ۔ جو افغانستان سے بغرضِ تجارت ہندوستان آیا۔ ان دنوں ہر طرف یاس و حزن کے بادل چھائے ہوئے تھے ۔ راجپال کے لگائے ہوئے چرکے روز بروز دلوں کی دنیا میں گہرے ہو رہے تھے ۔ اس نے مسلمانوں کے سینوں میں نفرت و حقارت کا آلاؤ دہک رہا تھا ۔ عبدالعزیز کے دل میں بھی گستاخِ رسول کے خلاف غضب و غصے کا ایک عظیم طوفان مقید تھا ۔ لیکن وہ اجنبی تھے اور دیارِ غیر میں ان کا کوئی واقف کار نہ تھا ۔ اسی دوران وہ عزیز و اقارب کو ملنے کی خاطر اپنے وطن گئے ۔ تو وہاں بھی ایک عجیب قسم کا ہیجان پایا ۔ ان کے وطن والے ایسے پے در پے ایمان سوز واقعات سے کبیدہ خاطر تھے اس معاملے میں کابل کے اخبار 'امان افغان' کا کردار ناقابلِ فراموش ہے ۔ جس نے آریہ سماج اور انگریزی عملداری پر کڑی تنقید کی ۔ بہر صورت عبدالعزیز جب اپنے وطن سے لوٹا تو اس کے دل میں ایک نئی دنیا آباد تھی ۔ اب وہ فکرِ معاش کی بجائے اپنے شکار کی تلاش میں سیدھا لاہور پہنچا ۔

لاہور میں اس کے چند دن حالات پڑھنے میں گزر گئے ۔ پھر ایک روز اس نے انارکلی بازار سے راجپال کی دکان کے متعلق پوچھا اور ہسپتال روڈ پر واقع بدذات ناشر کی دکان پر پہنچ گئے اس وقت مہاشہ راجپال کی دکان پر دو شخص بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے ۔ ان کی گفتگو کا موضوع مذہبِ اسلام اور بانیٔ اسلام (فداہ امی و ابی) کی حیاتِ طیبہ تھی ۔ عبدالعزیز نے ان سے کہا کہ میرے مذہب کی توہین نہ کرو لیکن وہ باز نہ آئے ۔ جس سے بات بڑھ گئی ۔ اور آپس میں تو تو اور میں میں ہونے لگی ۔ اسی اثنا میں دس بارہ ہندو دکاندار بھی جمع ہو گئے اور مذہبِ اسلام کے متعلق توہین آمیز طعن و تشنیع کرنے لگے ۔ اتفاق سے راجپال دکان پر موجود نہ تھا اور کاروبار اس کا دوست سوامی ستیانند چلا رہا تھا ۔ عبدالعزیز نے سمجھا کہ معروف شاتمِ رسول یہی ہے اور اپنا چاقو نکال کر اس پر برس پڑے چنانچہ عبدالعزیز کے بھرپور وار سے ستیانند شدید زخمی ہوا اور چاقو اس کی تلی تک جا پہنچ گیا البتہ ٹہنگ چند بزاز اور چونی لال کے زخم معمولی تھے ۔

اس حادثے سے پورے شہر میں سنسنی پھیل گئی اور حکومت کو اس قدر خطرہ لاحق ہوا کہ کنور دلیپ سنگھ کی کوٹھی پر فوراً پولیس کا سخت پہرہ لگا دیا گیا۔ تھانے میں غازی عبدالعزیز نے پولیس کو بتایا۔

"میں مقام روضہ علاقہ غزنی افغانستان کا رہنے والا ہوں۔ میرے باپ کا نام عبداللہ ہے۔ پانچ چھ سال ہوئے میں تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا۔ میں چار سال اجمیر میں رہا۔ چار پانچ ماہ احمد آباد میں گزارے اور کچھ عرصہ سندھ میں بسر کیا۔ وہاں سے لاہور آ گیا اور اللہ یار زار کی سرائے میں ٹھہرا۔ میں سرائے میں رہتا تھا اور کبھی شاہ محمد غوث کی مسجد میں سو یا کرتا۔ آج شام ساڑھے چار بجے کے قریب راجپال کی دکان پر دو ہندو بیٹھے مذہب اسلام کے متعلق توہین آمیز باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے مذہب کی توہین نہ کرو! اس پر وہ پہلے تو چپ سے ہو گئے۔ لیکن ایک منٹ کے بعد ہی مجھے اور اسلام کو پھر برا بھلا کہنے لگے۔ میں نے انہیں ایسی باتوں سے باز رہنے کے لیے کہا۔ اور بات بڑھ گئی۔ پھر میں نے اپنا چاقو نکال لیا۔ لاہور کے اندرون میں تنہا ہوں۔ یہاں میرا کوئی واقف نہیں ہے۔ نہ میں کسی کے وعظ یا درس میں شریک ہوا ہوں۔"

حالاتِ زندگی تو ہیں چہرے پہ ہی رقم
تعریف اور اپنی کریں کیا زبان کے ساتھ

پولیس نے تفتیش کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے دہلی دروازہ کے باہر حضرت شاہ محمد غوث کی درگاہ کے قریب رہنے والے پٹھانوں سے بھی پوچھ گچھ کی۔ جب ان لوگوں سے کوئی عقیدہ طلب معلومات حاصل نہ ہو سکیں تو فی الفور چالان مکمل کر کے مسٹر او گلوی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر دیا۔ تاریخ کے ان دو واقعات کی آپس میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ جب مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا تو سلطان محمودؒ (۱۵ ۴ ھ) ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ صدیوں بعد جب بھارت ماتا کے ایک زبان دراز بیٹے نے امام الرسل کی حرمت و تقدیس پر طعن و تشنیع کے تیر چلائے تو مرید خرقانیؒ کی مغفور روح عالمِ برزخ میں بھی چین سے نہ رہ سکی اور جہاد و سیوت کے پیکرِ خاکی کو اپنا مسکن بنایا۔ اس طرح (۱۳۴۶ھ) عبدالعزیز غازی نے محمود شیخ غزنویؒ کی اس سنت کو زندہ کر دکھایا۔

غازی عبدالعزیز نے ملاقاتیوں کے ایک گروہ سے فرمایا "میرے مولد کو فخر ہے کہ اس نے محمود غزنوی ایسا مجاہد، مبلغ اور بت شکن پیدا کیا۔ جس نے برصغیر میں قریب قریب کفر و الحاد کا خاتمہ کر دیا۔ یہی وہ مسلمان فاتح تھا۔ جس نے سُنا کہ ملتان میں ایک قرامطی فرقہ ہے۔ جو کہلواتا تو مسلمان ہے۔ لیکن اصل میں ہے بت پرست اور وہ اس قدر ناقص العقیدہ ہے جو نماز بھی پڑھتا ہے اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مورتیوں کی پوجا بھی کرتا ہے۔ غزنی کا وہ درویش صفت شہنشاہ یہ اندوہناک خبر سنتے ہی بگولے کی طرح ملتان پہنچا اور قرامطی داؤد حاکم ملتان کا احتساب کر کے پھر سے اسلام کا پرچم لہرا دیا۔"

عبدالعزیز غازیؒ نے بتایا "مجھے خواب میں سلطان محمود غزنویؒ نے حکم دیا تھا کہ جاؤ اور اس ملعون شاتم کے پرخچے اڑا کر ثوابِ دارین حاصل کرو! چنانچہ میں اسی جذبے سے سرشار لاہور پہنچا۔ میرے نزدیک سگ زرد بھی برادرِ شغال ہوتا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں راجپال کو واصل فی النار نہ کر سکا اور موت و حیات کی کش مکش سے مجروح بھی زندہ بچ نکلا ہے۔"

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو مسٹر اوگلوی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں غازی عبدالعزیزؒ کا چالان بدیں الزام پیش ہوا۔ استغاثے کی طرف سے مہتہ الیشر داس کورٹ انسپکٹر پیروکار تھے۔ لیکن غریب الوطن ملزم کی طرف سے کوئی وکیل پیش نہ ہوا۔ دورانِ سماعت جج اور ملزم کے درمیان ایک قابلِ تحریر مکالمہ بھی ہوا۔ عدالت نے ملزم سے پوچھا۔

عدالت! کیا تم نے اس چاقو سے سوامی ستیانند پر حملہ کیا؟

ملزم۔ ہاں کیا۔

عدالت! تم نے کیوں حملہ کیا؟

ملزم۔ انہوں نے میرے مذہبی جذبات کو مجروح کیا تھا۔

عدالت! (آلاتِ ضرب کی طرف اشارہ کر کے) کیا یہ چاقو اور استرا تمہارا ہے؟

ملزم۔ ہاں میرا ہے۔

عدالت! کپڑا ان کے بند ہونے والی جگہ پر کیوں لپٹا ہوا ہے؟

ملزم۔ تاکہ میں ان کو آسانی سے کھول سکوں۔

عدالت ! کیا تم ان کو ہر وقت کھلا رکھتے ہو ؟

ملزم - جی نہیں - میں نے انہیں اسی وقت کھولا تھا -

عدالت ! تم لاہور کب آئے ہو ؟

ملزم - آج سے ایک ماہ پیشتر آیا تھا -

عدالت ! کیا تم نے نانک چند اور چونی لال کو زخمی کیا ؟

ملزم - میں کسی شخص کو نہیں جانتا -

عدالت ! کیا تم نے نانک چند کے سوا کسی اور آدمی کو بھی زخمی کیا ہے ؟

ملزم - میں نہیں جانتا کہ میں نے کتنے آدمیوں کو زخمی کیا ہے -

عدالت ! کیا تمہیں کچھ اور کہنا ہے ؟

ملزم - میں اپنے فعل سے انکار نہیں کر سکتا نہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں -

۱۲ اکتوبر کو مقدمہ دوبارہ عدالت میں پیش ہوا - اور سرسری سماعت کے بعد عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا: سوامی ستیانند پر قاتلانہ حملہ کرنے کے جرم میں اسے سات سال قید سخت کی سزا دی گئی - جس میں تین ماہ قید تنہائی بھی شامل تھی - نانک چند اور چونی لال کو مجروح کرنے کے الزام میں بھی اسے اس قدر مزید سزا سنائی گئی - میعاد قید ختم ہونے پر پانچ پانچ ہزار کی تین ضمانتیں دینا لازمی تھیں - بصورتِ دیگر بعد از مدت اسیری تین سال قید محض کاٹنے کے لیے جیل میں ہی رہنا ضروری قرار دیا گیا -

تحقیق کے اس دوراہے پر راقم چپ نہیں رہ سکتا کہ ہمارے اکثر لکھنے والوں نے گلی کوچوں میں گشت کرتی روایات کو مستند جانا ہے اور سنی سنائی باتوں کو تاریخ کا ایک حصہ بنا دیا ہے - غازی عبدالعزیز کا کوہاٹ سے کوئی تعلق تھا - نہ کبھی وہ کوہاٹ گیا - ستیانند اس ہندوؤں میں ایک سنجیدہ سیاسی شخصیت تھی - جس کے مرنے پر مسلمان شاعروں نے بھی مرثیے کہے اور ان پر قتل کے الزام میں نہیں - بلکہ اقدامِ قتل کے سلسلے میں مقدمہ دائر ہوا تھا - جب کہ بعض اہلِ قلم نے رقم کیا ہے - غازی عبدالعزیز کوہاٹ کے رہنے والے تھے - انہوں نے راجپال کے شبے میں اس کے دوست دھوتی پوش مہاشہ ستیانند اس پر حملہ کیا اور قتل کرنے کے جرم میں انکو چودہ سال سزائے قید سنائی گئی -

شیرِ لاہوری کا ایک تاریخی شکار

- غازی علم الدینؒ گرفتاری کے شوق میں
- علم دینؒ ایامِ طفولیّت سے شباب کی دہلیز پر
- خاندانی پس منظر
- پردۂ اخفا میں سکنے والے چند حقائق

○

وسعتے پیدا کن اے صحرا کہ امشب در غمش
لشکرِ آہ من از دل خیمہ بیروں می زند

"شاتمِ رسول راجپال، قطب الدین ایبکؒ کے پہلو میں بیٹھا اس کی زخم زخم روح کا تماشا دیکھ رہا ہے اور سلطان الہند کی شکستہ قبر سے صبح و شام ایک چیخ بلند ہوتی ہے کہ شاید اس کا کوئی غیرت مند بیٹا تڑپ اُٹھے اور غم نصیب باپ کے لئے سامانِ مسرت مہیا کرے۔"

گستاخِ رسول کا قصہ تمام کرنے کی خاطر مختلف اوقات میں خنجر بکف تکبیر بلب متعدد جانباز قسمت آزمائی کرنے نکلے۔ اسی سلسلے میں خدا بخش اکو جہا اور غازی عبدالعزیز خاں دربارِ رسالت مآب سے اپنے حصے کا ثمرہ وصول کر گئے۔ زندان کی بظاہر پرآشوب زندگی کو محبوب سمجھ کر گلے لگا چکے تھے لیکن یہ سعادت عظمیٰ تو خدائے قدوس نے علم الدین کی قسمت میں لکھی تھی۔ غیظ و غضب اور نفرت و حقارت کا جو لاوا ایک مدت سے اہلِ اسلام کے سینوں میں ابل رہا تھا۔ بالآخر شعلۂ جوالہ بن کر پھوٹ پڑا۔ ایک مسلم نوجوان نے راجپال کا پیٹ چاک کر کے اسے ابدی نیند سلا دیا۔

برصغیر میں قطب الدین ایبک نے اسلامی حکومت کا ایک چراغ روشن کیا جو صدیوں تک آشیانۂ کفرزار میں اپنی ضیائیں بکھیرتا رہا۔ جب ہم باقاعدگی سے لہو کا تیل نہ ڈال سکے تو وہ چراغ بجھ گیا۔ فاتح مفتوح اور حاکم محکوم بن گئے۔ گردوں کی آنکھ نے یہ عبرت ناک منظر بھی دیکھا شاتمِ رسول راجپال، قطب الدین ایبک کے پہلو میں بیٹھا اس کی زخم زخم روح کا تماشا دیکھ رہا ہے اور سلطان الہند کی شکستہ قبر سے صبح و شام ایک چیخ بلند ہوتی ہے کہ شاید اس کا کوئی غیرت مند بیٹا تڑپ اٹھے اور غم نصیب باپ کے لیے سامانِ مسرت مہیا کرے۔

امر واقعہ یہ ہے جوں جوں احتجاج بڑھتا جا رہا تھا۔ راجپال کی زندگی کی گھڑیاں کم ہوتی جا رہی تھیں۔ اس پر دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ وہ کاروبار بھی آزادی سے نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے حکام سے درخواست گزاری کہ میری زندگی ہر وقت خطرۂ موت سے دوچار رہتی ہے۔ لہٰذا میری جان کی حفاظت کا مناسب بندوبست کیا جائے۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ہدایت پر پولیس نے دو ہندو سپاہی اور ایک سکھ حوالدار اس کی نگہداشت پر مامور کر دیا۔ لیکن راجپال کی ذہنیت عجیب قسم کے نفسیاتی سانچے میں ڈھل چکی تھی۔ وہ پہرے کی زندگی کو حراست کی زندگی سمجھنے لگا۔ ایک رات خود ہی اس نے لاہور کو چھوڑ دیا۔ چند روز ہردوار اور کانسی ٹھہر کر متھرا جا پہنچا۔ جہاں اس نے سیر و سیاحت سے اپنے دل کو بہلانے کی کوشش کی الغرض اسے لاہور کی یاد نے ستایا اور کچھ ہندوؤں نے بزدلی کا طعنہ دیا تو وہ چند ماہ بعد واپس آ گیا۔ اس کا خیال تھا۔ معاملہ رفع دفع ہو چکا ہے اور مسلمانوں کے جذبات سرد پڑ چکے ہیں۔ اب اس نے فضا کو خوشگوار پا کر کتب فروشی کا کاروبار دوبارہ شروع کر دیا اور اپنی حفاظت

کے لئے پولیس کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ اس کے چند دن بعد ہی وہ خاک و خون میں لت پت بڑے کرب سے تڑپ رہا تھا۔

۶ر اپریل ۱۹۲۹ء کو وہ ہفتے کا تاریخی دن تھا۔ اڑھائی بجے کے قریب غازی علم الدین اس بدذات ناشر کی دکان پر پہنچے اس وقت راجپال دکان کے اندر چارپائی پر چت لیٹا تھا۔ جب کہ استغاثے کے مطابق وہ ایک پوسٹ کارڈ لکھنے میں مصروف تھا۔ آپنے اسے للکارا اور کہا "اے کافر تیری موت کا وقت آن پہنچا ہے۔ میں تجھے زندہ ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ بس تو کتے کی موت مرنے کے لیے تیار ہوجا۔" اس للکار سے و عمر مجاہد کا ان پر ایسا رعب طاری ہوا کہ راجپال کے دو ملازم بھگت رام اور کدار ناتھ جو کتابوں کو ترتیب دے رہے تھے۔ وہ اپنی اپنی جگہ بت بن کر کھڑے دیکھتے رہ گئے اور راجپال نے کبوتر کی طرح شکاری کو سامنے پا کر اپنی آنکھیں موندلیں۔ بجیر بلب اس شیر دل حملہ آور نے اپنا خنجر نما چھرا بلا روک ٹوک اس کے سینے میں پیوست کردیا۔ جس کے بعد پے در پے وار کئے۔

جب مہاشہ راجپال کے ملازموں کو ہوش آیا تو انھوں نے آپ پر چند کتابیں پھینکیں جو ان کے قدموں کو چومتی ہوئی بازار میں گر گئیں اپنے کام سے فارغ ہو کر غازی موصوف سیدھے ودیارتن کے ٹال پر پہنچے۔ وہیں نلکے پر اپنے ہاتھوں کو راجپال کے ناپاک لہو سے صاف کیا۔ آپ پانی پی رہے تھے کہ دل میں خیال آیا کہ کہیں موذی زندہ ہی نہ بچ رہے۔ آپ نے مٹی کا گھڑا زور سے زمین پر دے مارا۔ جو ٹوٹ گیا اور اس کی کرچیاں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ پھر وہ دوبارہ اجپال کی دوکان کی طرف چل دیے۔ اتنے میں یہ شور برپا ہوا "مہاشہ جی قتل ہو گئے۔ قاتل قا.... تل ایک مسلمان ہے۔ خون آلود چھرا اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ مشرق کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دوڑو دوڑو، پکڑو ارے پکڑو جانے نہ پاتے" یہ سن کر غیر مسلموں میں بھگدڑ مچ گئی اور دونوں نوکر فتو نامی ایک مسلمان کو پکڑ لائے۔ آپنے یہ شور و غوغا سن کر باآواز بلند کہا۔ "نابکا راجپال کا قاتل میں ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے۔ سوچ سمجھ کر کیا ہے اور اپنے رسول ؐ کا بدلہ لیا ہے۔ اپنے پیغمبر محبوب خدا محمد مصطفیٰ کی حرمت و تقدیس کی حفاظت میرا فرض تھا۔ میرے نزدیک یہ کوئی جرم نہیں، کار خیر ہے۔" چند ہندوؤں نے آگے بڑھ کر آپ کو پکڑ لیا اور پولیس

کے حوالے کر دیا۔ جب پولیس نے آپ کو گرفتار کیا اس وقت ان کے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکل رہے تھے "خدا کا شکر ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی"۔ آپ نے اس مقصد میں کامیابی کے لیے راستے میں قدم قدم پر بصد عجز و نیاز یہ دعا مانگی تھی "اے خدا یہ سعادت آج تو مجھے ہی بخش دے"۔ جب غازی موصوف کے والد کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہوں نے صبر و تحمل کے ساتھ اس کو برداشت کر لیا اور کہا "مجھے اس سلسلے میں علم الدین کی گرفتاری کا کوئی رنج نہیں۔ البتہ میرے بیٹے نے اگر یہ فعل نہیں کیا اور ناحق گرفتار ہوا ہے تو مجھے دکھ ہو گا"۔

○

غازی علم الدین ۸ ذی قعدہ ۱۳۲۶ھ مطابق ۴ دسمبر ۱۹۰۸ء بروز جمعرات سریانوالہ بازار چابک سواراں کے کٹڑہ میں زینت آرائے گیتی ہوئے۔ آپ کی ولادت باسعادت پر بے حد خوشیاں منائی گئیں۔ دینی تعلیم کے لیے آپ کو چھ سال کی عمر میں تکیہ سادھواں کی مسجد میں بٹھایا گیا۔ دو تین سال تک باقاعدگی سے آپ کو مسجد اور مختلف مدرسوں میں بھیجا جاتا رہا۔ مگر آپ زیورِ تعلیم سے آراستہ نہ ہو سکے۔ اس کے بعد بازار نو ہریاں اندرون اکبری دروازہ بابا کالو کے مکتب میں انہیں داخل کرا دیا گیا۔ اسی مدرسے سے وہ حرف شناس ہوئے۔ چونکہ میلانِ طبع اس طرف مائل نہ تھا اس لئے انکو وہاں سے علیحدہ ہونا پڑا اور مستری نظام الدین صاحب سے جو بھاٹی دروازہ کے اندر رہا کرتے تھے، آبائی پیشہ سیکھنا شروع کیا۔ چند ماہ وہ مستری صاحب کے شاگرد رہے اور پیشے میں مہارت حاصل کر لی۔ منظوم سوانح عمری "عاشقِ رسول اللہ" میں چوہدری فضل کریم سند ھونے نقل کیا ہے کہ علم الدین نے کسبِ معاش کی خاطر اپنے باپ اور بڑے بھائی محمد الدین سے ہی نجاری کے کام میں مہارت حاصل کی تھی۔ جس کے بعد وہ شیخ نیاز محمد کی کوٹھی پر کام کرنے لگے۔ دو تین سال یونہی گزر گئے۔ پھر وہ برادرِ اکبر اور والدِ معظم کے زیرِ سایہ اپنی دکان چلانے لگے۔ آپ فطرتاً شوخ اور چنچل تھے لیکن اس کے ساتھ مذہبی رجحان بھی رکھتے تھے۔

آپ سیدھے سادھے نوجوان تھے۔ صاف گوئی آپکی نمایاں خوبی تھی۔ کذب و فریب سے وہ قطعاً ناآشنا تھے۔ موصوف کی عادات و خصائل بھی بڑی حد تک منفرد تھیں۔ اجنبی گھر سے وہ کچھ کھایا پیا کرتے تھے نہ ہوٹل سے خورد و نوش کو پسند کرتے۔ اس کے برعکس روکھی سوکھی روٹی انہیں

مرغوب تھی - مرچ اور پانی پر گزر اوقات کر لیا کرتے تھے -

آپکے والد کا نام میاں طالع مند ہے جو ذات کے شیخ اور پیشے کے لحاظ سے بڑھئی تھے - آپکا سلسلۂ نصب سات پشتوں سے بابا لہنا سنگھ سے جا ملتا ہے - ان کے مورث اعلیٰ شیخو جٹ ایک سکھ تھے - جس کی نسبت سے ہی ان کی اولاد آج تک شیخ کہلاتی ہے -

شیخو جٹ کے نو بیٹے تھے - سب سے بڑا بیٹا لہنا سنگھ جہانگیری عہد میں حلقہ بگوش اسلام ہوا - آپکے دیگر آٹھ بھائی سکھ مت کے پیرو تھے - انہوں نے قبولِ اسلام کی وجہ سے آپ کو بڑی اذیتیں دیں اور بالآخر گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا - چنانچہ آپنے تمام زندگی تبلیغِ اسلام میں گزار دی حضرت بابا لہنا سنگھ کا مزار موضع پڑھانہ شریف بر کی روڈ پر واقع ہے جو آج تک مرجع خاص و عام ہے - بابا لہنا سنگھ کے دو بیٹے تھے - ایک کی اولاد ابھی وہیں ہے اور برخوردار کی نسل سے شہید موصوف کا تعلق ہے - حضرت بابا لہنا سنگھ تا ہنوز شجرہ نسب ملاحظہ ہو -

۱ نومسلم بابا لہنا سنگھ ۲ برخوردار ، ۳ عیسیٰ ۴ عبداللہ ۵ جوایا ، ۶ عبدالرحیم ، ۷ میاں طالعمند -

غازی علم الدین شہید — محمد الدین (بڑے بھائی)

محمد الدین (بڑے بھائی): رشید احمد — رفیق احمد

رشید احمد: عبدالباسط ، کامران ، ابوبکر

رفیق احمد: عبدالواحد ، عبدالوحید ، کاشف احمد

○

مشیتِ ایزدی عظیم مقاصد کے لیے جن خاص بندوں کا انتخاب کرتی ہے - ان کی زندگی کے لمحے لمحے سے لاتعداد حقائق منسوب ہوتے ہیں - ان کے روز و شب سے انقلابی مد و جزر کو ہمیشہ ایک خاص نسبت ٹھہرتی ہے - کیونکہ مہد تا لحد ان کی کتابِ زیست میں ہر سطر کے اندر تاریخی واقعیت کا ایک لازوال خزینہ پنہاں ہوتا ہے - غازی علم الدین کا سن پیدائش بھی تاریخ میں ایک خاص اہمیت

رکھتا ہے۔ اسی سال مدینہ منورہ میں حجاز ریلوے کا اجرا ہوا۔ ایران میں احمد شاہ قاچار اور عوام کے مابین خانہ جنگی ہوئی۔ مراکش میں نہتے عربوں نے فرانسیسیوں کو شکستِ فاش دی۔ افغانستان میں امیر حبیب اللہ نے پہلی دفعہ عوام کے لئے مدارس کھلوائے۔ سلطان عبدالحمید خاں نے ترکوں کو پارلیمنٹری حکومت عطا کی اور غیر مسلم احمدی فرقے کا سربراہ غلام احمد قادیانی ہیضے کے مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہوا۔

میاں طالع مند ایک ماہر دست کار تھے۔ وہ کاروباری سلسلے میں مختلف شہروں میں آیا جایا کرتے تھے آپ نے ۱۹۱۱ء میں میر عثمان علی خاں نظام حیدر آباد دکن کی ایک کوٹھی بمقام دہلی میں لکڑی کا کام کیا اور خود نظام کی دستخطی سندِ حسنِ کارکردگی حاصل کی۔

میاں علم الدین جب سنِ بلوغت کو پہنچے تو اپنے والد کے ہمراہ پہلے پہل ملتان اور خانیوال کے سفر پر گئے۔ پیرِ دستگیر نامی صاحب نے انبالہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ لاہور کے نواح میں ایک قصبہ بکھن شریف واقع ہے۔ یہ جگہ خواجہ محمد بخش ؒ ایک ولیِ کامل کا مسکن تھی۔ وہ جیدِ عالمِ دین اور ایک بلند پایہ مفسر تھے۔ میاں طالعمند کو ان سے انتہائی عقیدت تھی۔ ان کی مقناطیسی شخصیت اس خوش قسمت نوجوان کو بھی اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

جن دنوں لاہور میں آریہ سماجیوں کی شرارتیں نقطہ عروج پر تھیں۔ میاں طالع مند ؒ نے کوہاٹ ریلوے سٹیشن کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ چنانچہ وہ کاروباری سلسلے میں یکم جنوری ۱۹۲۸ء کو اپنے نورِ نظر علم الدین کو بھی ساتھ لے گئے۔ اس دوران آپ ورزش بھی کرنے لگے تھے اور جسمانی نشو ونما روز افزوں تھی۔ چنانچہ آپ عمر سے کہیں زیادہ تنومند جوان معلوم ہونے لگے۔

۵ تیرے بدن کا ہر جز اک شعر خوبصورت
لیکن یہ تیری آنکھیں، پورا کلام جیسے

اٹھتی جوانی تھی۔ خدوخال کے لحاظ سے آپ خوبرو اور شکیل نوجوان تھے۔ ان کا جسم سڈول رنگ سرخ وسپید، پیشانی چوڑی، بال سیاہ اور گھنگریالے تھے۔ آپ کی آنکھیں جھیل کی مانند گہری اور تخمِ انبہ سے مشابہ تھیں۔ جن میں اکثر اوقات سرخ ڈورے فروزاں رہتے۔ مردم سیاہ دراز، ہونٹ باریک اور گردن ایک پُروقار انداز سے اٹھی ہوئی تھی۔ البتہ چہرے کی ساخت

قدرے کتابی تھی۔ شکل و شباہت کے علاوہ بھی وہ خوبی و کمال کا مرقع تھے۔ لہجے میں ملائمت اور بلا کی مٹھاس ہوتی۔ دیکھنے والے کا جی چاہتا تھا از سرتا پا بلا توقف دیکھتا چلا جائے اور سننے والوں کی تمنا ہوتی کہ وہ ہمہ تن گوش سنتے رہیں۔ گویا آپ نقاشِ فطرت کا ایک حسین شاہکار تھے۔ اگر کوئی ہندو ہوتا تو وہ برملا کہہ اٹھتا کہ کسی سنگ تراش نے سنگِ مرمر کو طویل مدت تک اپنی شبانہ روز محنت شاقہ سے تراشا۔ تب یہ صورت بنی ہے۔

تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت
ہم جہاں میں تیری تصویر لیے پھرتے ہیں

مارچ ۱۹۲۹ء میں جب علم الدین کے بڑے بھائی محمد الدین کے ہاں بچی پیدا ہوئی تو آپ نے نومولود بھتیجی کو دیکھنے کے لئے لاہور کا عزم سفر کیا۔ ۲۸ مارچ کو ان کی سگائی آپ کے ماموں سراج دین کی دختر نیک اختر فاطمہ بی بی سے قرار پائی۔ میاں محمد الدین خلافت کمیٹی کے ایک فعال کارکن تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ کی زوردار تقریریں ان کے قلب و ذہن پر جادو کا اثر کیے ہوتے تھی ایک رات دونوں بھائیوں کے درمیان اس موضوع پر باتیں ہوئیں۔ دو ایک دن بعد علم الدین نے اپنے بڑے بھائی سے پوچھا "جو راجپال کو واصل فی النار کر دے اسے کیا انعام ملے گا؟" محمد الدین نے بتایا "اس خوش قسمت کو سولی چڑھا دیا جائے گا"۔ آپ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا "یہ تو بہت اچھا انعام ہوا"۔ اس کے بعد ایک رات موصوف خواب استراحت کے مزے لوٹ رہے تھے۔ رات کے پچھلے پہر آپ نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا اور بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ اس رات آپ سرتا پا پسینے میں شرابور کروٹیں بدلتے رہے لیکن کسی صورت ان کو چین نہ آ رہا تھا۔ ایک روز آپ نے ڈراؤنا خواب دیکھا۔ دوسرے دن ہی آدھی رات کے وقت اس مکان میں ایک سفید پوش بزرگ کی زیارت ہوئی۔ انہوں نے فرمایا "علم الدین اٹھ اور جا کر اس بے غیرت کا کام تمام کر دے"۔

ایک روایت یہ ہے کہ غازی موصوف اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھے تھے۔ راجپال کی بدکلامی موضوع گفتگو تھی۔ تمام نہایت غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ مگر غازی علم الدین یہ سنتے ہی بالکل خاموش ہو گئے۔ رنگ اڑ گیا اور ان پر کپکپی طاری ہو گئی۔ بعض کے خیال میں غازی صاحب کوہاٹ کی کسی مسجد میں نماز پڑھنے گئے وہاں ایک بزرگ آدمی گریہ زاری کر رہا تھا اور اس کی زبان سے یہ

الفاظ نکل رہے تھے۔" کاش! میں جوان ہوتا کہ مردودِ رسالت پناہ کو جہنم رسید کر سکتا۔ ہائے افسوس میں چلنے پھرنے سے بھی معذور رہوں۔ یا رسول اللہؐ میرے اس جرمِ ضعف کو معاف فرما دینا"۔ یہ سن کر غازی علم الدین نے جھٹ پوچھا "کون ہے وہ میرے رسولؐ کا گستاخ؟" بزرگ نے بڑے پیار سے اپنے پاس بیٹھا کر انہیں بتایا" لاہور میں ایک کھتری ذات راجپال نامی کی شرارتیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ وہ ملعون ہمارے نبی پاکؐ کو برسرِ عام گالیاں دیتا ہے"۔ اس پر علم الدین بولے" میں نے اس خبیث کا نام پہلے بھی سن رکھا ہے۔ اب تمہیں جلد ہی کوئی خوشخبری مل جائیگی"
گو یہ تمام روایات قرین قیاس ہیں اور کسی ایک کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخر الذکر دونوں روایات ابتدائی وجوہ ہوں اور بعد ازاں خواب میں ارشاد فرمایا گیا ہو۔ بہر صورت قریب تر از صحت خواب کے واقعات ہی ہیں۔ رات کو خواب میں دیکھا اور صبح جب سورج نے مشرق کے افق سے ضو فشانی کے تیر چھوڑے تو آپ کے دل کی دنیا بدل چکی تھی۔ منگنی کو ابھی آٹھ روز ہی گزرے تھے اور بتاشے بھی تقسیم نہ ہوئے تھے کہ آپ نے حقیقی عشاق کی فہرست میں اپنا نام جلی حروف سے لکھوا لیا۔

شہادت کی خواہش کے پس منظر میں ایک مقدس جذبہ کارفرما تھا۔ اوائل ۱۹۲۸ء کا ذکر ہے علم الدین کے کم عمر بھتیجے شوکت کا انتقال ہو گیا۔ آپ اسے دفنانے کے بعد واپس آ رہے تھے کہ راستے میں گڑھی شاہو کے مشہور عبادت گزار بزرگ مولوی تاج الدینؒ کا جنازہ ملا۔ جس میں لاتعداد لوگ شامل تھے۔ اس چھوٹی سی عمر میں جنازے کی اہمیت نے آپ کے دل میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ اس سے متاثر ہو کر وہ بار بار فرماتے تھے" زندگی ہو تو ایسی اور موت ہو تو ایسی۔ جس سے کچھ نصیحت عبرت حاصل ہو سکے"۔ جس عفت مآب شجر کی چھاؤں میں علم الدین کی زندگی پروان چڑھی اسے چراغ بی بی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کے قلب و ذہن پر اس نیک دل اور دیندار خاتون کی گہری چھاپ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۶ اپریل ۱۹۲۹ء کو علم الدین غازی کی لافانی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس دن انہوں نے والدہ محترمہ سے خلافِ معمول دگنا جیب خرچ حاصل کیا اور ایک خنجر نما چھرا خریدا۔ جس کی تشنہ نوک سے غیرت و حمیت کا ایک انوکھا باب لکھا جانا تھا۔

مکتبہ عشق کے دستور نرالے ہیں۔ اس میں زندگی سے کہیں زیادہ موت کی تڑپ ہوتی ہے۔ دنیوی

مصلحتیں منشائے محبوب پر نچھاور کی جاتی ہیں۔ محبت میں فراق ہو یا وصال، ہر ایک میں کمال لذت ہے۔ عشق کی شراب میں دھت رہنے والے! ساجن کی بارگاہ میں باریابی کے لئے کتنے بھیس بدل لیتے ہیں۔ ۵ راپریل کو علم الدین نے عشق والوں کی اس سنت کو پورا کر دکھایا اور شاہ عالمی لال مسجد کے غسل خانے میں کانوں میں سوراخ کر لئے۔ تاکہ ہندوؤں کے روپ میں وہ راجپال تک بآسانی پہنچ جائیں۔

کون سمجھے کہ بے غرض جذبے
کتنے اچھے ہیں اپنی فطرت میں

۶۔اپریل کو ہفتے کا دن تھا۔ فصل بہار کی رعنائیاں حس لطیف رکھنے والوں کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں علم الدین کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک عود کر آئی تھی اور صبح سے ان کے ہونٹوں پر تبسم کی مدھم لکیریں نمودار تھیں۔ آج کے دن کا آغاز آپ نے حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ کی آرام گاہ پر عقیدت کے پھول چڑھا کر کیا۔ فجر کی نماز بھی انہوں نے اسی جامع مسجد میں ادا کی اور بلند منصب پر تقرری کا پروانہ حاصل کیا۔ اہلِ نظر کی کیمیاگری دلوں کی دنیا بدل دیتی ہے۔ دراصل آدمی کتابوں سے نہیں۔ نظروں سے بنائے جاتے ہیں اور روحانی اعمال کے احکامات ہمیشہ روحانی مراکز سے جاری ہوتے ہیں۔

قبل از دوپہر انہوں نے اپنی بھاوجہ اقبال بی بی سے چاول کھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جب وہ دیگچی میں گھی ڈالنے لگیں تو آپ نے ازراہ مذاق ان کے ہاتھ کو جنبش دی کہ گھی کا برتن چاولوں میں انڈیل دیا۔ اس پر موصوفہ نے قدرے خفگی کا اظہار کیا تو آپ نے شگفتہ مزاجی سے فرمایا "بھابی میں خوش ہوں، بہت ہی خوش آج میری قسمت سنور جائے گی۔ مدینے والے آقا و مولاؐ نے مجھے اپنی حرمت و تقدیس کی حفاظت کے لیے چن لیا ہے۔ مجھے ایک عظیم سعادت نصیب ہونے والی ہے۔ میں آج راجپال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

عین دوپہر کے وقت آپ نے مع حاجی صدیق احمد ایک اور دوست کے ساتھ دین محمد (دینا) پان فروش کی دکان پر چاول تناول فرمائے۔ بعدازاں ان میں تحائف تقسیم کئے۔ ٹارچ عطا فرمائی اور ایک دوست کو رومال کا تحفہ دیا اور انہیں اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا۔ سورج جب نصف النہار سے مغرب کی سمت سرکنے لگا تو غازی مرد نے برتن اور اپنا کوٹ ایک دوست کے ہاتھ گھر بھجوائے اور خود دکان پر پہنچ کر چھرا راجپال کے پیٹ میں اتار دیا۔ جس سے اس کی آنتیں بھی کٹ گئیں۔

راجپال کا قاتل کون!

- راجپال بھڑکتے شعلوں میں جل گیا۔
- کیا علم الدین شراب کے رسیا تھے؟
- ہندوؤں کی تحریریں بولتی ہیں۔

○

عجب کیا ہے گر مہ و پرویں میرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را

"ساقی ازلی پیاسوں کو پلانے کے لئے مائل بہ کرم رہتے ہیں اجمیر اور کلیر میں بھی یہی کاروبار ہوتا ہے۔ یہ شراب پیالوں میں نہیں نظروں سے پلائی جاتی ہے۔ البتہ بادہ کش کو کیف و سرور بقدرِ ظرف عطا ہوتا ہے۔"

قتل کے اس واقعہ کی رپورٹ کدرا ناتھ نے انار کلی تھانہ میں درج کرائی۔ علم الدین کو پولیس پہلے ہی حراست میں لے چکی تھی۔ متعلقہ حکام نے جائے واردات کا معائنہ کیا اور نعش کو اپنی تحویل میں لے کر متعلقہ کوائف کی خانہ پری کی۔ جامہ تلاشی کے دوران مردہ راجپال کی جیب سے ۲۔۳۲ روپے کچھ کاغذات اور ایک گھڑی برآمد ہوئی۔ متعدد ضلعی حکام موقعہ پر موجود تھے۔ پولیس نے لاش کی تصویر اتاری اور اسے پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھجوا دیا۔

موت ایک مدت سے راجپال کے آگے پیچھے رہتی تھی۔ یوم مرگ صبح سے ہی اس کے معمولات میں فرق آگیا تھا۔ "راجپال کے آخری دن کی تفصیلات" کے عنوان سے بندے ماترم کا بیان ہے کہ "راجپال ہر روز صبح کے وقت لارنس گارڈن (جناح باغ) کی سیر کو اہل وعیال کے ہمراہ جایا کرتا تھا۔ لیکن ۶۔ اپریل کو وہ دریا کی طرف گیا۔ سیر سے واپس آکر دکان میں کام کیا۔ ایک بجے کھانا کھایا اور پھر دکان میں آکر کام شروع کر دیا۔ اڑھائی بجے قاتل نے آکر کام تمام کر دیا۔"

گرفتاری کے وقت غازی مرد نے صاف ستھرا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ ان کے سر پر گلابی رنگ کا رومال تھا۔ انہوں نے دھاری والی قمیض اور سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ ان کے کپڑوں پر مہاشہ راجپال کے ناپاک خون کے قطرے بدستور موجود تھے۔ وہ پرسکون اور مطمئن نظر آتے تھے ان کے چہرے سے گھبراہٹ یا کسی پریشانی کا شائبہ تک نہ تھا۔ البتہ اُن کی آنکھوں میں بلا کا خمار تھا بعض کہتے ہیں کہ گرفتاری کے وقت غازی علم الدین کا رنگ زرد تھا۔ اور وہ اس اندیشہ سے کہ کہیں میں بھی پہلوں کی طرح ناکام ہی نہ رہا ہوں۔ مگر جب اپنی آنکھوں سے محنت ٹھکانے لگی دیکھی تو وُہ ہشاش بشاش ہو گئے۔

گلوں کی گود میں جیسے نسیم آکر مچل جائے
اسی انداز سے ان پرخمار آنکھوں میں خواب آیا

راجپال کے قتل کی خبر ایک مختصر وقت میں پورے شہر کے گلی کوچوں میں گشت کرنے لگی۔ لوگ جوق در جوق موقعۂ واردات کی طرف امڈے چلے آرہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد ہندو خاصے سہم گئے اور سارے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا اس کے ساتھ ہی ہندو مسلم کشیدگی پر قابو پانے کی خاطر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ رات کو راجپال کا پوسٹ مارٹم ہو چکا

تھا اور علی الصبح ہندوؤں کا ایک جمِ غفیر ہسپتال کے اردگرد جمع ہو گیا۔ پورا مجمع ہندو دھرم کی جے اور ویدک دھرم کی جے کے نعرے لگا رہا تھا۔ عموماً لوگ برہنہ سر تھے اور وہ بھجن گا کر جلوس شہر میں سے گزارنے کا مطالبہ کر رہے تھے لیکن حکام کو ہندو مسلم فسادات کی بو سونگھائی دے رہی تھی۔ اس مطالبے کو مان کر وہ اپنے لیے نئے مسائل کھڑا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بالآخر لالہ ارجن دیو نے راجپال کی دھرم پتنی (بیوہ راجپال) سرسوتی دیوی کی طرف سے پرامن رہنے کی یقین دہانی کرائی اور ضلعی حکام نے نعش ورثاء کے حوالے کر دی۔ ہندوؤں کا جلوس میو ہسپتال سے نکل کر نیلا گنبد کے راستے انارکلی بازار سے ہوتا ہوا مہاشہ مقتول کی دکان پر گیا اور وہاں سے راوی روڈ پہنچا اور گورودت بھون کے آگے سے گذر کر شمشان بھوامی (رام باغ) نزد بادامی باغ میں داخل ہوا۔ نعش کو سپردِ آتش کرنے کا فریضہ مہاتما ہنس راج جی نے سرانجام دیا۔ جس کے بعد اس کی راکھ راوی کی تند و تیز موجوں کے سپرد کر دی گئی۔ پولیس نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے تفتیش کا دائرہ وسیع کر رکھا تھا۔ غازی کے گھر کی تلاشی کے دوران ہر ادنیٰ اور اعلیٰ چیز توڑ پھوڑ دی گئی۔ پولیس میں اکثریت سکھ لوگوں کی تھی۔ انہوں نے ہر شے پامال کر دی۔ غازی علم الدین کے باپ کو حکومت کی ناجائز سختیوں سے دوچار ہونا پڑا اور ان کے بڑے بھائی کو دہلی دروازے کے قریب سے گرفتار کر لیا گیا۔ حالانکہ وہ اس معاملے سے بالکل لاعلم تھے۔ پولیس نے غازی علم الدین کو دو دن پولیس لائن کی حوالات میں بند رکھا اور ضروری پوچھ گچھ کے لیے آٹھ دن کا ریمانڈ حاصل کر لیا۔ پولیس نے فتو نامی ایک اور مسلمان کو بھی تفتیش میں شامل رکھا۔ یہ شخص راجپال کا کرایہ دار تھا اور مقتول کے لواحقین اس کے متعلق بھی شک رکھتے تھے چونکہ علم الدین اپنے فعل کا متواتر اقرار کئے جا رہے تھے۔ اس لئے مقدمے کی تفتیش اور چالان میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی اور چھرا معائنے کے لئے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ فتو نامی ملزم کا پولیس نے چودہ دن کا ریمانڈ حاصل کیا تھا۔ اس دوران مفروضہ ملزم پولیس کی حراست میں رہا۔ شک کی بنا پر دو اور آدمی بھی زیرِ تفتیش رکھے گئے مگر ان سے کوئی مفید مطلب معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ مدت ریمانڈ کے بعد مسٹر فرخ حسین بیرسٹر کی دلچسپی سے فتو کو رہائی مل گئی اور دیگر دو اشخاص کو پولیس نے ازخود چھوڑ دیا۔ راجپال کے قتل کے بعد ہندو جرائد کا رویہ انتہائی دلخراش ہو گیا تھا۔ غلط بیانیوں کا ایک انبار لگا دیا گیا۔

درجنوں دلآزار اداریے طبع ہوتے۔ جن میں "راجپال نمبر" اور غلط ملط مضامین کی ایک خاص تعداد شامل بھی کوئی کہتا تھا "ایک نہیں ہزاروں راجپال پیدا ہوں گے" کہ ایک نہیں ایسی ہزاروں کتابیں لکھی جائیں گی۔ کسی نے کہا راجپال شہید ہے۔ اس معاملے میں ملاپ، پرتاب اور بندے ماترم پیش پیش تھے۔ ۱۳ اپریل کے پرتاب میں ایک نظم کا عنوان "امان اللہ اور راجپال" دیا گیا اور ایک بے حقیقت ناپاک ذرہ خاک کو آفتاب سے تشبیہ دی گئی۔ پرتاپ کا مہاشہ کرشن بھی جگر گدازی، سینہ کاوی اور دلخراشی سے نڈھال آنسو بہا رہا تھا۔ اس نے ۱۸ اپریل کو "آل انڈیا راجپال ڈے" منانے پر بڑا زور دیا اور لکھا "راجپال ہم سب کا تھا۔ ہم سب راجپال کے ہیں۔ اس لیے ہر ایک ہندو ماتر شہیدوں کی قدر کا جذبہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ ہمارا یہ فرض ہے۔ کہ اس دن اپنی اپنی شردھا کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور بھینٹ کریں۔ پیارے آریہ بھائیو! اپنے عمل سے ثابت کرو کہ راجپال تمہارے لیے مرا نہیں زندہ ہے۔ آؤ ہم دنیا کو دکھا دیں کہ ہمارے شہیدوں کے بلیدان سے ان کا کام بند نہیں ہوا کرتا۔ کیوں نہ اب مہاشہ کی وجہ شہرت منصۂ عام پر آتے"۔ ہندو مختلف ہتھکنڈوں سے اپنے فطری تعصب اور تنگ نظری کا جگہ جگہ مظاہرہ کرتے رہے۔ انہوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ راجپال بھی قاتل تھا۔ لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کا قاتل۔ اس کی شائع کردہ کتاب کا ایک ایک حرف مثلِ نشتر تھا جس سے عقائد و جذبات کو قتل کیا گیا۔ "راجپال کا اصلی قاتل" کے عنوان سے ریاست اخبار نے کیا حقیقت پسندانہ اداریہ شائع کیا تھا کہ "راجپال کا قاتل علم الدین ہی ہے۔ لیکن اگر واقعات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو برادرانِ وطن کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ راجپال کا اصلی قاتل اس کتاب کا مصنف ہے جس کی اشاعت سے کروڑوں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو سخت صدمہ پہنچا اور انہوں نے حکومت سے درخواست کی کہ اس کتاب کے لکھنے اور شائع کرنے والے پر مقدمہ دائر کیا جائے۔ چنانچہ پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے راجپال پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمہ کا جو نتیجہ نکلا وہ مسلمانوں کے نزدیک کوئی زیادہ قابلِ تحسین نہ تھا۔ اگر کتاب مذکور کا مصنف اخلاقی جرأت سے کام لے کر اپنے جرم کو قبول کر لیتا اور اس کی پاداش میں اسے قید اور جرمانہ کی سزا ہو جاتی تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ راجپال کا قتل کبھی ظہور میں نہ آتا۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی جان بڑی قیمتی ہوتی ہے اور

اس کے ضائع کرنے والے کو قانون کی انتہائی سزا برداشت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جو شخص زبان یا قلم کی نوک سے اپنے لاکھوں ہم جنسوں کے جذبات کو مجروح یا قتل کرتا ہے۔ وہ بھی قاتل ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ سوسائٹی نے ایسے قاتلوں کے لئے جو سزا تجویز کر رکھی ہے وہ اس جرم کے سدِ باب کے لیے ناکافی ثابت ہوئی ہے۔ اگر سوسائٹی جذبات کے قتل کو ایک سنگین جرم قرار دے اور لوگ اپنی تحریر اور تقریر میں اس امر کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ اس سے دوسروں کی دلآزاری نہ ہو تو دنیا میں بہت سے فتنوں اور ہنگاموں کا خود بخود تدارک ہو جائے گا۔"

راجپال کا قاتل اس کتاب کا مصنف تھا اور راجپال خود اپنا قاتل آپ بھی ہے وہ بار بار توہین رسولؐ کا اعادہ کر کے کچھ کے لگاتار رہا۔ جس سے اہلِ اسلام کے سینوں میں ایک جوش، ہیجان اور اضطراب پیدا ہو گیا۔ مہاتما گاندھی کے علاوہ سناتن دھرمی، کوئی مہاسبھائی، آریہ سماجی، کوئی سنگھٹی حتیٰ کہ کوئی کانگریسی ہندو بھی ایسا نہ تھا۔ جس نے راجپال کے اس فعل پر نفرت کا اظہار کیا ہو۔ وقت گذرتا گیا۔ زمانے نے کئی رنگ بدلے اور بالآخر علم الدین نے اس ملعون کا کام تمام کر دیا۔

○

اب شیر دل غازی کے متعلق ہندو اخبارات کے جھوٹے بیانات شائع ہونا شروع ہو گئے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کسی نے کچھ کہا۔ کسی نے کچھ اور کہا۔ ایک نے لکھا قاتل کے معشوق نے یہ شرط باندھی تھی۔ دوسرے نے طبع کیا سنا جاتا ہے وہ شراب پیئے ہوئے تھے۔

مندرج الزامات حقیقت سے کس قدر دور ہیں۔ معشوق بھلا ایسی شرائط کہاں لگاتے ہیں اور جن کی زندگیاں محبوباؤں سے منسوب ہوتی ہیں وہ اپنے رقیبوں کو مارا کرتے ہیں، رسولِ خدا کے دشمن کو نہیں۔ دوسرا الزام کہ وہ بادہ آشام تھے۔ اس سے ہم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ شاتمِ رسول کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ان کا لہجہ اس کا اظہار کر رہا تھا اور آنکھوں کی مستی بھی کہہ رہی تھی کہ وہ شراب پیئے ہوئے تھے۔ لوگوں کا کہنا ہے جب وہ اپنے فرض سے سرخرو ہو کر بازار میں نکلے تو یوں جھوم رہے تھے۔ جیسے خم کے خم چڑھا رکھے ہوں۔

گمان ہوتا تھا وہ قتل گاہ سے نہیں ابھی ابھی کسی میخانے سے آئے ہیں۔ اب ذرا حدیثِ بادہ صہبا کو چھیڑنا چاہیئے۔

آنکھوں سے پلاتے رہیئے، ساغر میں نہ ڈالو
اب ہم سے کوئی جام اٹھایا نہیں جاتا

ہوشربا مئے انبہ کے جوس سے بنتی ہے نہ وہ انگور کا رس ہوتی ہے۔ بلکہ اس کا خمیر کربلا کی بھٹی میں کڑھتا ہے اور اس شراب کی درآمد میخانہ یثرب سے ہوتی ہے۔ صراحی نجفِ اشرف سے لی جاتی ہے۔ پیمانہ بغداد سے خریدا جاتا ہے۔ ساقی ازلی پیاسوں کو پلانے کے لیے ہمہ وقت مائل بہ کرم رہتے ہیں۔ اجمیر اور کلیر میں بھی یہی کاروبار ہوتا ہے۔ یہ شراب پیالوں میں نہیں نظروں سے پلائی جاتی ہے۔ البتہ بادہ کش کو کیف و سرور بقدرِ ظرف عطا ہوتا ہے۔ اس میدان میں ساقی و پیمانہ کی باتیں بڑی روح افزا ہیں۔ لیکن ہندو تو ان باتوں سے اپنے دل کا غبار نکال رہے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مقدمے کو تقویت پہنچے اور مسلمان اس جانباز سے بدظن ہو جائیں۔

اس لیے میاں محمد الدین برادر علم الدین غازی نے ۱۲۔ اپریل کو روزنامہ انقلاب میں اپنا ایک مضمون شائع کرایا۔ جس میں آپ نے لکھا "پرتاب کی ۹۔ اپریل کی اشاعت میں" علم الدین کے مزید حالات"، کے زیرِ عنوان جو خبر شائع ہوئی اس میں لکھا گیا ہے کہ وہ قتل کی چار دن سے تیاریاں کر رہا تھا۔ کام پر نہیں جاتا تھا۔ جس چھرے سے اس مہاشہ راجپال کو قتل کیا وہ گھر میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے کئی دن قتل کی کوشش کی۔ ۴۔ اپریل (یومِ قتل راجپال) کو وہ گھر سے نکلنے لگا تو ماں سے کہا کہ چاول پکا دو۔ سنا جاتا ہے کہ وہ شراب پیئے ہوئے تھے۔ اس کے دو بھائی ہیں۔ جب گھر سے نکلا تو اس نے اپنا کوٹ اتار کر ایک شخص کے ہاتھ گھر بھجوا دیا نیز والدہ سے کہلا بھیجا کہ سمجھ لینا میرا لڑکا پیدا ہی نہیں ہوا۔" یہ حالات غلط ملط شائع ہوئے ہیں اور اکثر ہندو اخبارات کے من گھڑت افسانے ہیں۔ علم الدین نے آج تک شراب پی ہے نہ والدہ نے اس کو چاول پکا کر دیے۔ علم الدین نے ایسی فرمائش کی نہ ہی اس کے دو بھائی ہیں بلکہ اس کا صرف ایک بھائی ہے (یعنی راقم الحروف محمد دین) ۱۱۔ اپریل کے پرتاب میں لکھا

ہوا ہے کہ ۱۰ اپریل کو جب ملزم لاری میں بٹھا کر لے جایا گیا تو اس نے باپ سے کہا میرے لیے دعا کرنا۔ اگرچہ چلا بھی گیا تو کوئی بات نہیں۔ باپ نے جواب میں کہا کہ میں تمہیں جانے نہیں دونگا یہ بھی از سرتا پا غلط ہے۔ امر واقعہ یہ ہے علم الدین کا باپ اس سے آج تک مل بھی نہیں سکا پھر گفتگو کے کیا معنی؟ ہندو اخبارات ایک پراپگنڈے کے تحت اس قسم کے قصّے دل سے گھڑ گھڑ کر شائع کر رہے ہیں۔"

اوپریوی کونسل کے دروازے پہ دستک

- غازی علم الدین کا مقدمہ عدالت میں۔
- قائداعظمؒ کی ہائی کورٹ میں مدلّلانہ جرح۔
- حقائق کا چہرہ گرد و غبار میں اٹا ہے۔

○

گر پڑی دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر آج
اب وفاؤں کا مری شاید جواب آنے کو ہے

اُن کی خواہش تھی ۔ علم الدین اور عدالت کو اُن کے حالے پر چھوڑ دیا جائے ۔ کیونکہ اس معاملے میں رحم کی اپیل گناہ ہے ۔ اقبال ِ فعل سے انحراف ایک عظیم جرم ہے اور علم الدین کو ایسی حسین موت کی آغوش سے چھین لینا اُن کی ذات پر بہت بڑا ظلم ہے ۔

مہاشہ راجپال کے قتل کا مقدمہ - ۱۰ اپریل کو سنٹرل جیل میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر ای ایس لوئیس کے سامنے پیش ہوا - علم الدین غازی کو ہتھکڑیاں پہنا کر ایک بنچ پر بٹھا دیا گیا - اس روز آپ صاف کپڑوں میں ملبوس تھے - چہرے سے کسی قسم کی اُداسی نہ ٹپکتی تھی - شروع کارروائی میں اس مردِ مجاہد کی طرف سے کوئی وکیل پیش نہ تھا - سرکار کی طرف سے رائے صاحب ایشر داس پیروی مقدمہ کر رہے تھے - عدالت میں چند پریس رپورٹر موجود تھے جو لمحہ بہ لمحہ کی کارروائی قلمبند کرنے میں مصروف تھے - کمرۂ سماعت کے باہر کافی تعداد میں سریانوالہ بازار کے مسلمان موجود تھے۔

استغاثے کی جانب سے پہلا گواہ راجپال کا ملازم کدارناتھ پیش ہوا - جس نے بیان میں کہا کہ جب مہاشہ جی پر حملہ ہوا - میں دوکان میں موجود تھا - ملزم نے جلدی سے چھرا گھونپ دیا اور پھر بڑی سرعت رفتاری کے ساتھ باہر نکل گیا - اس وقت میں کتابوں کو ترتیب دے رہا تھا - اسے روکنے کے لئے میرے ہاتھ میں کچھ نہ تھا - میں نے دکان کی کتابیں اٹھا کر ملزم پر ماریں جو باہر بازار میں جا گریں - پھر میں نے چیخ وپکار شروع کر دی - جس پر ادگرد کے لوگ اس واقعہ پر متوجہ ہوئے۔

دوسرا چشم دید گواہ بھگت رام تھا - اس نے عدالت میں اپنا جو بیان لکھوایا - اس کا مافی الضمیر، واقعات کی ترتیب اور الفاظ کا اتار چڑھاؤ بھی قریب قریب وہی تھا جو اس سے پہلے کدارناتھ نے بتایا۔

ودیا رتن گواہ نے بیان کیا کہ "پکڑو پکڑو" کی آواز سن کر میں ہوشیار ہوا - ملزم میرے کوارٹر کی طرف آیا - اس کے پیچھے لالہ پرمانند اور لالہ نانک چند کپور اور کئی دوسرے اشخاص دوڑے چلے آ رہے تھے - جب میں نے ملزم کو اپنی گرفت میں لیا تو اس نے کہا "میں نے اپنے رسول ؐ کا بدلہ لیا ہے" - میں نے دیکھا کہ مہاشہ راجپال کے کپڑے خون میں تربتر تھے - چھرے کا منہ دیوار کی طرف تھا اور وہ خون میں لت پت تھا - چھرے کی نوک ٹوٹی ہوئی تھی اور دستہ کالے رنگ کا تھا - نیز وہ بھی خون میں لت پت تھا۔"

استغاثے کے چوتھے گواہ لالہ نانک چند کپور نے اپنا تفصیلی بیان قلمبند کراتے ہوئے کہا کہ ملزم دوڑتا ہوا لالہ سیتا رام لکڑی والے کے ٹال میں داخل ہوا - وہاں لالہ ودیا رتن نے اس کو پکڑ

لیا اور ہم بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ ملزم نے وہاں بلند آواز سے کہا "یہ میرا دشمن نہ تھا بلکہ میرے رسولؐ کا دشمن تھا۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے"۔ اس کے بعد ہم نے چھری دیکھی جو خون میں لت پت تھی۔ اتنے میں راجپال ٹھنڈا ہو گیا اور ہسپتال پہنچایا گیا اس پر عدالت نے غازی علم الدین سے پوچھا "تم گواہ سے کچھ کہنا چاہتے ہو"۔ آپ نے مسکراتے ہوئے نفی میں جواب دیا۔

دویا رتن کے بعد لالہ پرمانند سوداگر کاغذ نے مذکورہ بالا بیان کی تائید کی۔ اس کے تمام بیان کا ملخص بھی یہی تھا جو اوپر رقم کیا جا چکا ہے۔

اس کارروائی کے بعد پولیس کے ملازموں کی شہادتیں ہوئیں۔ رحمت خاں کانسٹیبل تھانہ کچہری نے کہا "گشت کرتے ہوئے مجھے ایک لڑکے نے بتایا تھا کہ راجپال مارا گیا ہے"۔ برکت علی کانسٹیبل کے ہمراہ میں موقع پر گیا اور میں ہی ملزم کے لیے تھانہ سے ہتھکڑی لے کر آیا تھا۔ پھر برکت علی، شیر محمد اور خوشحال نامی سپاہیوں نے اپنے رسمی بیان سے عدالت کو آگاہ کیا۔ تاراچند ہیڈ کانسٹیبل نے بیان کیا کہ میں نسپتیلا مندر سے آ رہا تھا۔ شور و غوغا سن کر موقعہ واردات پر پہنچ گیا۔ ہنسراج حوالدار کے بعد چودھری جلال الدین وڑائچ سب انسپکٹر جو چک دادن (وزیر آباد) کے رہنے والے تھے نے بیان کیا کہ میں گھر پر تھا۔ مجھے ٹیلی فون پر بلایا گیا۔ چودھری رحمت علی سب انسپکٹر نے کہا کہ میں نے تفتیش کی تھی۔ ملزم نے دورانِ تفتیش بتایا تھا کہ میں نے چھری ایک کباڑی سے خریدی ہے (چھریاں دکھلانے پر کہا) یہ دو چھریاں آتما رام کباڑی کی دکان سے ہیں۔ آتما رام کباڑی ولد گوپی مل دکاندار کمیٹی باغ (ذات کموہ عمر ۷۰ سال) نے کہا یہ چھری مجھ سے خریدی گئی ہے۔ قتل کے روز ایک شخص ساڑھے نو بجے کے قریب میری دکان پر آیا۔ یہ ایک دن پہلے بھی آیا۔ اور پوچھا "کیا آپ کے پاس چھریاں ہیں"۔ میں نے کہا ہاں ہیں۔ اس کے کہنے پر میں نے پانچ چھ ویسی چھریاں جیسی عدالت میں پیش ہیں۔ ملزم کو دکھائیں۔ میں نے سوا روپیہ مانگا۔ آخر کار ایک روپے پر سودا طے پا گیا۔ وہ چھری رکھ گیا اور کہا کہ میں روپیہ لے کر آتا ہوں۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ واپس آیا اور روپیہ دے کر چھری لے گیا۔ یہ دو چھریاں بطور نمونہ ہیں۔ بعد از قتل پولیس نے مجھ سے پوچھ گچھ کی۔ میں نے تھانے میں اس شخص کو پریڈ کے دوران دس بارہ اشخاص میں سے شناخت بھی کیا تھا۔

لالہ جواہر لال انسپکٹر سی۔ آئی ڈی لاہور نے بیان کیا کہ میں نے اس مقدمہ کی تفتیش کی ہے

ملزم کے ہاتھ پر دو زخم بھی دیکھے تھے اور اس کا خون آلود کرتہ بھی اتروایا. سماعت کے دوران ایک نوجوان بیرسٹر مسٹر فرخ حسین کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے. جن کا دفتر موچی دروازہ کے باہر تھا آپنے مجسٹریٹ سے مخاطب ہو کر کہا "ملزم کی طرف سے میں پیروی کروں گا" عدالت سے اجازت لے کر انہوں نے چند منٹ علم الدین سے بات چیت کی اور کہا کہ یہ ایک نہایت اہم مقدمہ ہے. یہ ایسا مقدمہ ہے جس میں ملزم کی زندگی اور موت کا سوال ہے - ملزم کی خواہش ہے کہ مقدمہ ملتوی کر دیا جائے تاکہ اسے صفائی پیش کرنے کا پورا حق حاصل ہو. عدالت نے کہا ! سماعت مقدمہ ملتوی نہیں کی جاسکتی - مسٹر فرخ حسین بیرسٹر نے کہا کہ مقدمہ ملتوی کر دیا جائے. عدالت کے اس سوال پر کہ آپ کس بنا پر التوائے مقدمہ چاہتے ہیں. آپنے کہا ہمیں فائل دیکھنے کا موقع نہیں ملا - کافی جرح کے بعد آخر زیر دفعہ ۵۲۶ ضابطہ فوجداری ایک ہفتے کی مہلت مل گئی.

۱۶ . اپریل کو مسٹر فرخ حسین کی درخواست انتقالِ مقدمہ مسترد ہونے کے بعد بقیہ سماعت ۱۹ . اپریل کو ہوئی - اس دن غازی علم الدین دو سپاہیوں کی حراست میں ہتھکڑی پہنے ہوئے تھے اور نہایت خاموشی سے جھوم رہے تھے - آپکے والد بزرگوار بھی قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے استغاثے کی طرف سے مہتہ ایشر داس اور غازی مرد کی طرف سے خواجہ فیروز الدین پیروکار تھے - خواجہ صاحب نے عدالت سے کہا - مقدمہ کا چارج میں نے لے لیا ہے - پہلے روز جو صاحب پیش ہوئے تھے وہ التوائے مقدمہ کے خواہش مند تھے - میرا موکل اس کی ضرورت نہیں سمجھتا.

اس باہم گفتگو کے بعد دیگر رسمی گواہوں کی شہادتیں ہوئیں - نقشہ نویس سید محمد عثمان ساکن مزنگ نے بیان کیا کہ موقع کا نقشہ میرا بنایا ہوا ہے جو کہ موقعہ کے مطابق درست ہے - اس نے نقشے میں ذیل کے مقامات کی نشاندہی کی.

۱ وہ جگہ جہاں مقتول سویا ہوا تھا -

۲ وہ راستہ جہاں سے قاتل بھاگ کر ودیا رتن کے ٹال پر پہنچا -

۳ ودیا رتن کا ٹال اور وہ نلکا جہاں قاتل ہاتھ دھو رہا تھا -

ڈاکٹر ڈاہی متعین میو ہسپتال نے بیان کیا کہ مہاشہ راجپال کی نعش کا پوسٹ مارٹم میں نے کیا تھا.

نعش کی شناخت ڈاکٹر گدھاری لال نے کی تھی جو مقتول کو جانتا تھا۔ اس کی انگلیوں، سر، چھاتی اور پٹھوں پر زخم تھے اور کلیجہ بھی مجروح تھا۔ کلیجہ کے قریب پسلی ٹوٹی ہوئی تھی۔ چھاتی کے بائیں طرف کا زخم ۱/۲ لمبا اور ۱/۲ چوڑا تھا۔ اس کی گہرائی ۱/۲ ۷ تھی۔ چوتھی پسلی کٹ گئی تھی اور بائیں طرف پٹھے پر سخت زخم تھا۔ مقتول کو کل ایک درجن ضربات آئیں۔ میرے خیال میں موت اس ضرب کی وجہ سے ہوئی جو کلیجہ پر لگی۔ یہ کسی تیز نوکدار ہتھیار سے لگ سکتی ہے۔ اس زخم کی گہرائی ۱/۲ ۴ اور چوڑائی ۱/۲ ۴ (پونے چار انچ) تھی۔ قتل کے دوسرے روز ایک چھرا میرے پاس لایا گیا۔ اس سے بھی ایسی ضربات لگ سکتی ہیں۔ اس کارروائی کے آخر پر غازی علم الدین نے کمرۂ عدالت میں دھلے ہوئے کپڑے زیبِ تن کیے۔

○

۲۴۔ اپریل کو اس مقدمہ کی دوبارہ سماعت ہوئی۔ کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ غازی علم الدین کی طرف سے خواجہ فیروز دین اور خواجہ نیاز احمد پلیڈر صاحبان پیروکار تھے۔ اس روز تارا چند اور کدارناتھ سے چھری کی شناخت کرائی گئی اور کورٹ ڈی ایس پی نے رپورٹیں پیش کیں۔ جس کے بعد عدالت نے غازی علم الدین پر زیر دفعہ ۳۰۲ تعزیراتِ ہند لگا دی اور مقدمہ سیشن کے سپرد کرتے ہوئے ہدایت کی کل صفائی کے گواہوں کی فہرست عدالت میں داخل کرا دی جائے۔ ۲۵۔ اپریل کو اس سلسلے میں میاں علم الدین کو مسٹر لوئیس ایڈیشنل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا اور صفائی کے گواہوں کی فہرست داخل کرائی گئی۔ جن کے اسماء درج ذیل ہیں۔

معراج دین ولد میاں امام دین ٹھیکیدار لاہور، سید ظفر علی شاہ ولد اصغر علی شاہ لاہور، معراج دین ولد چراغ دین ٹھیکیدار۔ لاہور، میاں طالع مند ولد عبدالرحیم سریانوالہ بازار لاہور، مستری رحیم بخش خرادی سبزی منڈی لاہور، چراغ دین ٹھیکیدار بیرون موچی دروازہ لاہور، چوہدری محمد گھسیٹا سابق میونسپل کمشنر لاہور، محمد دین ولد پیر بخش چنگڑ محلہ لاہور، نبی بخش سکنہ برج اٹاری ضلع لاہور، پیرا ندتہ قوم جٹ لاہور، مسٹر ہیری پروپرائٹر نائیڈ ہوٹل لاہور، احمد دین ٹیلر ماسٹر ہسپتال روڈ لاہور تاج دین ولد مولوی احمد دین ہسپتال روڈ۔ لاہور، کریم بخش درزی ہسپتال روڈ لاہور، میاں عبدالرشید مالک ملاپ پریس لاہور، شیخ ولایت علی آرمی پریس ہسپتال روڈ لاہور، شیخ اظہر علی آرمی پریس،

۔ فنا برکت علی آرمی پریس، محمد دین ٹیلر ماسٹر ہسپتال روڈ لاہور، الٰہ بخش ولد مہتاب پہلوان بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔ شیخ غلام غوث سوداگر چوب بیرون لوہاری دروازہ لاہور، ملک محمد شریف سوداگر چوب بیرون لوہاری دروازہ لاہور میاں میراں بخش سوداگر چوب فروش بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔

○

۱۵ مئی ۱۹۲۹ء کو غازی علم الدین کا مرافعہ مسٹر ٹیپ سیشن جج کی عدالت میں پیش ہوا اس روز کی کارروائی میں چار اسیروں کا چناؤ کیا گیا جن میں دو مسلمان ایک ہندو اور چوتھا ایک سکھ تھا۔ ۱۴ مئی کو دوبارہ سماعت ہوئی۔ استغاثے کی طرف سے لالہ راج کشن اور غازی علم الدین کی طرف سے خواجہ فیروز الدین، مسٹر سلیم، اور خواجہ نیاز احمد پیروکار تھے۔ عدالت کے باہر لاتعداد مسلمان موجود تھے اور کمرۂ عدالت معززین شہر سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ صفائی کے جملہ گواہ پیش کرنے کی درخواست پہلے ہی مسترد ہو چکی تھی۔ مسٹر فیروز الدین ایڈووکیٹ نے ایک تحریری درخواست ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گزاری تھی کہ گواہوں کی فہرست کے ساتھ ڈاکٹر کا نام بھی سیشن کورٹ میں بھیجا جائے۔ اس لیے تمام مطلوبہ گواہ عدالت میں حاضر تھے۔ مسٹر ٹیپ سیشن جج نے کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے گواہان استغاثہ کے بیانات لیے۔ اس روز غازی موصوف نے دوپہر کا کھانا اپنے رشتہ داروں کے ساتھ کھایا۔ شیخ حسن دین شروع سے آخر تک غازی علم الدین کے پاس کرسی پر بیٹھے رہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ان کے مابین جذبۂ عشق و محبت کی باتیں بھی ہوتی رہیں۔

۔ نکیرو نہ پوچھو، میرے دل کو دیکھو
فضاؤں میں دل کی مدینے ملیں گے

بطلِ حریت کو ایک مدت سے قائل کیا جا رہا تھا کہ وہ اقبالِ قتل نہ کریں مگر غازی موصوف انکار کرنے سے ہمیشہ انکار کرتے رہے۔ سیشن کورٹ میں غازی علم الدین کے عشق کا امتحان تھا۔ انکار سے بچ جانے کا امکان، لیکن اقرار سے موت یقینی تھی۔ ایک پلڑے میں عشقِ رسولؐ اور دوسری طرف پوری دنیا کھڑی تھی۔ اس مرحلے پر آپ عجیب کشمکش کا شکار ہو گئے۔ انہیں ہر

لانے سے مجبور کیا گیا کہ اپنے تئیں ایک بار ہی بے قصور ظاہر کرو۔ کتنا صبر آزما تھا اس دوراہے پر کوئی فیصلہ۔ اکلوتے بھائی کی پریشان نظروں سے سامنا تھا۔ بہن کی معصوم آرزوئیں دم توڑتی ہوئی نظر آئیں۔ ممتا دامن پھیلائے بیٹھی تھی۔ شفقتِ پدری بھی بصورت مجسمۂ سوال کھڑی دیکھی۔ احباب نے رشتۂ دوستی کا واسطہ دیا۔ اہل علم نے قرآنی آیات کی تاویلیں پیش کیں۔ وکلائے قانونی نکات گوش گزار کیے۔ ان کا ایک سوال تھا۔ سب کا یہی تقاضا تھا کہ اپنے لیے نہ سہی۔ ہماری خاطر ہی اقبالِ قتل سے باز آجاؤ۔ پھر وہ لمحہ بھی آگیا جب سب کی پر امید نگاہیں آپ کی طرف اٹھ گئیں۔ جب کہ جج مذکور نے پوچھا "کیا تم نے قتل کا جرم کیا ہے؟" آپ نے سوچا، سمجھا، سر اوپر کو اٹھایا، زیرِ لب الفاظ پر غور کیا اور فرمایا "میں نے کسی انسان کو قتل کرنے کا کوئی جرم نہیں کیا"؟ یہ وہ الفاظ ہیں جن کے ذریعے آپ ہر دو جانب سے سرخرو ہو گئے۔ یہ الفاظ نہایت غور طلب ہیں۔ اس سے یہ مطلب ہرگز اخذ نہیں ہوتا کہ غازی صاحب نے خود کو بے قصور ظاہر کیا۔ دراصل ان کی نگاہ میں راجپال انسان نہ تھا۔ وہ اسے سگِ آوارہ سے بھی بدتر سمجھتے تھے ان کی نظر میں یہ فعل جرم نہیں کارِ خیر تھا۔ ایک فرض تھا جو انہوں نے پورا کیا۔

خراب فردِ عمل ہو نہ جائے اے سیماب
اسے جنابِ رسالت مآب دیکھیں گے

۲۲ مئی کو سیشن کورٹ میں سماعت کا آخری دن تھا۔ اسیسروں نے اپنا اپنا فیصلہ عدالت کے گوش گزار کیا۔ ہندو اور ایک سکھ اسیسر کی رائے کے مطابق علم الدین مجرم تھا۔ جب کہ مسلم اسیسروں کی رائے اس کے برعکس تھی۔ اس روز مسٹر ٹیپ کے روبرو وکلائے فریقین کے مابین قانونی بحث بھی ہوئی۔ مسٹر سلیم ایڈووکیٹ نے غازی کے حق میں مدلل اور معقول دلائل پیش کیے۔ آپ نے کہا "استغاثے کے مطابق قاتل جب دکان میں آیا دو آدمی موجود تھے (جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں) ان کے سامنے اس نے حملہ کیا۔ مقتول نے حملہ روکا۔ جس کی وجہ سے اس کے ہاتھوں میں زخم بھی آئے۔ آخر کئی ضربوں کے بعد وہ اسے مار گرانے میں کامیاب ہو گیا اور کام کر کے بھاگ گیا۔ مگر تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اثنائے قتل میں کیوں نہ بولے اور کیوں نہ انہوں نے شور و غوغا بلند کیا تاکہ قاتل موقع پر پکڑا جاتا۔ پھر جو چھری پکڑی گئی ہے اس

کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ اس سے آدمی قتل نہیں ہو سکتا۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب قاتل آگیا۔ راجپال دوکان میں بیٹھا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے اس کا کام تمام کر کے ہوا ہو گیا۔ ملازموں نے آکر دیکھا تو راجپال کو مردہ پایا تو چلاتے ہوئے دوڑے اور ایک مسلمان کو پکڑ کر قاتل بنا دیا۔ حالانکہ اگر یہ قاتل ہوتا تو یہ بھاگ کر انارکلی کے پر رونق بازار میں شامل انبوہ کثیر ہو کر بچ نکلتا نہ کہ غیر آباد طرف جا کر پکڑا جاتا۔ جس دکاندار سے چھری خریدنا بیان کیا جاتا ہے۔ وہ کمزور نظر آدمی ہے۔ اسے کس طرح یاد رہ سکتا ہے کہ فلاں شکل و صورت کا ایک آدمی آیا تھا جو چھری خرید کر لے گیا۔ مقدمہ بالکل ثابت نہیں لہٰذا جج صاحب کو چاہیئے کہ ملزم کو بری کر دیں۔"

کہتے ہیں جب مسٹر سلیم ایڈووکیٹ صاحب اپنے دلائل سے فارغ ہوئے تو اس کے تھوڑی دیر بعد مگر فیصلہ سناتے جانے سے کچھ وقت قبل غازی موصوف نے چلا چلا کر کہنا شروع کر دیا "ناموس رسولؐ کا قاتل میں ہوں۔ میں نے ہی نابکار راجپال کو جہنم رسید کیا ہے۔" درمیانی وقفے کے بعد عدالت نے غازی علم الدین کو سزائے موت کا حکم سنا دیا اور مجموعہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۳۷۴ کی رو سے اپنے فیصلے کی توثیق کرانے کے لیے مسل ہائی کورٹ میں بھیج دی۔ جب یہ فیصلہ سنایا گیا تو آپ نہایت پر سکون تھے اور زیر لب ایک نعت گنگنا رہے تھے۔ چہرے سے رونق و متانت برستی تھی۔ البتہ باہر عدالت میں جمع شدہ مسلمانوں میں کافی جوش و خروش تھا۔ انہوں نے جب عدالت کا فیصلہ سنا تو وہ دیر تک اللہ اکبر اور غازی علم الدین زندہ باد کے نعرے لگاتے رہے۔

O

اب نوجوان عاشقِ رسول کا مقدمہ سب مسلمانوں کا مقدمہ بن گیا تھا۔ اس حکم سے برصغیر کے مسلمانوں میں کہرام مچ گیا۔ اس موقع پر حاجی نظام دین، فتح محمد کمبوہ شیر فروش اور ملک لال دین قیصر نے محلہ وار "علم الدین ڈیفنس کمیٹی" تشکیل دی۔ جو چند ہی روز میں اہالیانِ شہر کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ چنانچہ متعدد جلسے ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ "علم الدین ڈیفنس کمیٹی" کی اپیل پر عوام نے دل کھول کر چندے جمع کرائے۔ اپیل کی غرض سے فیصلے کی نقول حاصل کر کے نامی وکلاء نے اس مسل کا بغور مطالعہ کیا۔ اس پینل میں میاں تصدق حسین خالد، مسٹر فرخ حسین بار ایٹ لاء مسٹر محمد سلیم ایڈووکیٹ، میاں فیروز الدین اور خواجہ نیاز احمد کے نام شامل ہیں ان ماہرِ قانون وکلاء

نے شبانہ روز مطالعہ کے بعد آخر کار ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ عدالتِ عالیہ میں غازی علم الدین کا مرافعہ ۳۰ مئی کو منظور ہوا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اسی روز مسٹر راج کشن بیرسٹر سپیشل پبلک پراسیکیوٹر کو لدھیانہ سے ۲۵ مئی کا لکھا ہوا ایک سرخ مکتوب موصول ہوا۔ خط کا مزاج دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس کی تحریر یوں تھی۔

"جنابِ والا۔ چونکہ آپ نے راجپال ایسے ذلیل کی پیروی کر کے ایک بے گناہ شخص کو پھنسایا ہے۔ لہٰذا آپ کو بذریعہ عریضہ ہٰذا مطلع کیا جاتا ہے کہ اگر آپ نے آئندہ پیشی ہائی کورٹ میں اپنا رویہ نہ بدلا تو آپ کو اور مردود جہنم رسید کے ملازم کو بے رحمی سے قتل کر کے سرگ باش کر دیا جائے گا اس ضمن میں سپاہی نمبر سات (۷) کو جس نے راجپال کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر اپنی بہادری کا جیتا جاگتا ثبوت دیا ہے۔ اطلاع دی جاتی ہے کہ وہ مقررہ وقت کے اندر تادیبی کارروائی کر کے دوبارہ اپنی بیباکی کا ثبوت دے"۔

خط کے نفسِ مضمون سے جو کچھ مترشح ہوتا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ یہ نامہ مجاہدِ ملت، بلبلِ حریت، پروانۂ شمعِ رسالت کے کسی پروانے نے تسکینِ دل کے لیے لکھ پھینکا ہوگا۔ جس کا مقصد راقم کے خیال میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عدالتِ عالیہ میں شاید اس دھمکی آمیز خط کی بنا پر استغاثے کی طرف سے کوئی وکیل پیش نہ ہو۔ مزید یہ کہ آریہ سماجیوں پر واضح ہو جائے گستاخانِ رسالت کا خاتمہ کرنے کے لیے ایک فرد نہیں پوری تنظیم کام کر رہی ہے۔ اس سے قطع نظر ہائی کورٹ میں مرافعہ منظور ہونے کے بعد غازی علم الدین کے رشتہ داروں کی بڑی خواہش تھی کہ اس مقدمے میں کسی ماہر قانون دان کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اس زمانے میں سر تیج بہادر سپرو ایک شہرت یافتہ وکیل تھے۔ بعض اہل الرائے نے اس کا نام بھی تجویز کیا۔ ڈاکٹر اقبال کا مکان ان دنوں علمی، ادبی اور دینی و سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ جس میں قوم کی قسمت کے فیصلے ہوا کرتے۔ علامہ اقبال خود علم الدین غازی کے بڑے قدردان تھے۔ اور اس مقدمے سے ان کو ایک خاص لگاؤ تھا۔ وہاں رات کو اکثر سر محمد شفیع، میاں محمد الدین، سر مراتب علی، ملک لال دین قیصر، میاں عبدالعزیز مالواڈہ وغیرہم اکٹھا ہوا کرتے تھے اور دیر تک اس موضوع پر تبادلۂ خیال ہوتا رہتا۔ علامہ اقبال کی خدمت میں جب یہ معاملہ پیش ہوا تو آپ نے کہا۔ بلاشبہ سر تیج بہادر سپرو ایک شہرۂ آفاق وکیل ہیں اور غیر ...

کے بہت بڑے سکالر بھی لیکن میرا خیال ہے۔ اس کے لیے مسٹر جناح بہتر ثابت ہوں گے۔ کیونکہ اس مقدمے میں حق و باطل کی آویزش ہے اور سر تیج بہادر سپرو اس معاملے میں انصاف نہ کر سکیں گے۔ گویا مسٹر جناح کی لاہور میں آمد کے محرک و موید سر محمد اقبالؒ ہیں۔

محمد علی جناح ان دنوں بمبئی میں پریکٹس کرتے تھے۔ نیلگوں سائبان کے نیچے ان کی قانون دانی کا بڑا شہرہ تھا۔ مسٹر جناح اس زمانے میں آل انڈیا کانگریس کے ممبر تھے۔ وہ افقِ سیاست پر آفتاب شہرت بن کر طلوع ہوئے تھے اور نہ ہی وہ قائد اعظم بنے تھے۔ اس وقت تک مسلم لیگ بھی ان کی اعلیٰ اور بے لوث قیادت سے محروم تھی۔

چنانچہ ڈاکٹر اقبال کے مشورے سے "علم الدین ڈیفنس کمیٹی" کے چوہدری فتح محمد کمبوہ اور دیگر مسلم معززین نے بمبئی میں ایم اے جناحؒ سے رابطہ قائم کیا۔ اس سلسلے میں چند روز خط و کتابت ہوتی رہی اور پھر کمبوہ صاحب حاجی نظام الدین کے ہمراہ ان سے بمبئی جا کر دفتر میں بھی ملے۔ بعد ازاں جناح صاحب کے استفسار پر مسٹر فرخ حسین بار ایٹ لا نے آپ کو مقدمے کی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ایم اے جناح نے ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد ۲۷ جون کو بنام عدالتِ عالیہ ایک برقی پیغام بھیجا کہ اپیل کنندہ کی پیروی کے لیے مجھے اجازت دی جائے۔ اس وقت کے قانون کے مطابق ایک ہائی کورٹ کا وکیل دوسرے ہائی کورٹ میں پریکٹس نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے محمد علی جناح (قائد اعظمؒ) نے جب پنجاب ہائی کورٹ سے مقدمے میں پیش ہونے کی اجازت مانگی تو عدالت مذکور کے ایک جسٹس مسٹر براڈوے نے اختلاف کیا۔ لیکن چیف جسٹس سر شادی لال نے بعض مصلحتوں کی بنا پر ان کو پیش ہونے کی اجازت دے دی۔

○

ایم اے جناح ۱۴ جولائی کو پہلی بار لاہور تشریف لائے اور فلیٹیز (FLATTIES) ہوٹل میں قیام کیا۔ اگلے روز غازی علم الدین کا مقدمہ مسٹر جسٹس براڈوے اور جسٹس جانسٹون کے ڈویژنل بنچ میں پیش ہوا۔ لوگوں کا اجتماع صبح نو بجے سے شروع ہو گیا تھا۔ پریس رپورٹر بھی سات سات مقامات پر رک کر بہ ہزار دقت گیلری تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ مقدمے کی کارروائی سننے کے لیے درج ذیل اہم شخصیتیں بھی کمرۂ عدالت میں موجود تھیں۔ ۱۔ سید حبیب شاہ مالک اخبار

سیاست، مولوی غلام محی الدین، مسٹر محمد طفیل بیرسٹر، خلیفہ شجاع الدین، مدن کمند لال پوری، چودھری گھسیٹا، چودھری محمد حسین ایڈووکیٹ لدھیانہ، ملک محمد امین، مسٹر محمد شریف ایڈووکیٹ، مسٹر بدر الدین بیرسٹر، مدیر اخبار ہنٹر دیوان چمن لال، سردار رام سنگھ، لالہ گوکل چند نارنگ، خواجہ فیروز الدین بیرسٹر، مہتہ امین چند ایڈووکیٹ وغیرہم۔

مقدمے میں مسٹر فرخ حسین نے قائد اعظمؒ کی معاونت کی۔ استغاثے کی طرف سے دیوان رام لال اور مسٹر جیون لال کھنہ پیش ہوئے۔ گیارہ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ جب میاں طالع مند ایک اور شخص کی معیت میں مسٹر جناح کی قانونی کتب کی ایک بھاری گٹھڑی اٹھا کر لائے۔ دیگر مقدمات کی سماعت کے بعد پونے گیارہ بجے، جج صاحبان بہمراہی مسٹر فرخ حسین عدالت کے کمرے میں داخل ہوئے اور گیارہ بج کر پانچ منٹ پر جناح صاحب نے اپنے دلائل کا آغاز کیا۔

۱: آپ نے فرمایا میں سب سے پہلے اس پولیس افسر کی شہادت کی طرف عدالتِ عالیہ کی توجہ مبذول کراتا ہوں۔ جس نے بیان کیا کہ ہم ملزم سے یہ اطلاع پاتے ہی کہ میں نے آتما رام کباڑی سے چھری خریدی ہے۔ فوراً اس کی دوکان پر پہنچے۔ پولیس نے بذاتِ خود کوئی تفتیش نہیں کی اور صرف ملزم کے بیان پر اکتفا کیا۔ لیکن قانونِ شہادت دفعہ ۲۷ کی رو سے ملزم کا بیان بطور شہادت نہیں پیش ہو سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ جج صاحبان اس کا فیصلہ صادر کریں۔ (مسٹر جسٹس براڈوے نے کہا کہ شہادت کے قابلِ قبول یا ناقابلِ قبول ہونے کے سوال کا فیصلہ کرنا عدالت ماتحت کا کام ہے) مسٹر جناح نے کہا آپ اس نکتہ کا اب نہیں تو آخر میں فیصلہ کر سکتے ہیں۔

۲: موقع کی شہادتوں میں صریح اختلاف۔ سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا کہ اب غور طلب امر یہ ہے کہ ملزم کو اس مقدمے میں ماخوذ کرنے کی کافی وجوہ ہیں یا نہیں۔ ۶ اپریل کو راجپال ہلاک کیا گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس نے راجپال کو قتل کیا وہ کون تھا؟ استغاثے کی شہادت میں دو عینی گواہوں کی شہادت کے قابلِ اعتماد ہونے کو پرکھنے کے لیے میں فاضل ججوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کراتا ہوں کہ یہ دونوں گواہ راجپال کے ملازم تھے۔ ان شہادتوں کو پرکھنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان کے بیانات کے اختلافات دیکھے جائیں۔ آپ نے کدارناتھ کا بیان پڑھ کر سنایا اور کہا کہ سخت تعجب کی بات ہے کہ اس بیان میں بھگت رام کا کہیں نام تک نہیں آیا۔ حالانکہ وہ

اس وقت دکان پر موجود تھا۔ برخلاف اس کے گواہ بھگت رام کا بیان ہے کہ اس نے ملزم کا تعاقب کیا اور کدار ناتھ نے بھگت رام کا نام نہیں لیا۔ حالانکہ ایک عینی شاہد کی حیثیت سے کدار ناتھ کو بھگت رام کا نام سب سے پہلے لینا چاہیئے تھا۔ یہ ایک نہایت ہی اہم نکتہ ہے اور عینی شاہد کا جزو اعظم ہے۔

۳: طبی شہادت سے تردید۔ کدار ناتھ گواہ نے ارتکاب جرم کا جس قدر وقت بتایا ہے۔ طبی شہادت سے اس کی تردید ہوتی ہے طبی شہادت سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ طبی شہادت سے ظاہر ہے کہ گواہ کے بیان کردہ وقت سے دو چند وقت صرف ہوا ہے۔

۴: اقبالِ جرم ناممکن ہے۔ مسٹر جناح نے فرمایا کہ گواہ کا بیان ہے کہ جب ملزم کو پکڑا گیا تو اس نے کہا "میں نے کوئی چوری نہیں کی۔ ڈاکہ نہیں مارا۔ میں نے صرف اپنے پیغمبر کا بدلہ لیا ہے"۔ ایک لمحہ کے لیے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ملزم بھاگتا جاتا تھا۔ اس کا تعاقب بھی کیا گیا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ بھاگنے کی کوشش کرنے والا کوئی شخص گرفتار ہوتے ہی فوراً اس طرح اقبالِ جرم کرلے۔ یہ شہادت بھی پیش کی گئی کہ وہ متواتر اقبالِ جرم کرتا رہا۔ پولیس کا ایسے موقع پر فرض تھا کہ وہ مجسٹریٹ کے روبرو ملزم کے بیانات قلم بند کراتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ ہر ایک تجربہ کار پولیس افسر کے لیے ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ ملزم نے راجپال کی دوکان پر آکر بھی اقبال جرم کیا۔ ایسا غیر ممکن ہے وہاں پولیس موجود تھی۔ جس کے سامنے ایک نو عمر لڑکا ایسی جرأت کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ یہ سب کہانی ایسی غیر قدرتی ہے کہ اس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

۵: مسٹر جناح نے کہا کہ یہ سب کہانی غلط ہے۔ گواہ نے نہ صرف بھگت رام کا نام ترک کر دیا ہے بلکہ وزیر چند کا نام بھی چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ وزیر چند نے ملزم کا تعاقب کیا تھا۔ جرح پر گواہ نے کہا ہے کہ میں وزیر چند کے نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔ میں اس شہادت پر صرف یہی کہوں گا کہ اگر گواہ سچ بولتا تو وہ بھگت رام کا نام ضرور لیتا۔ اس کے علاوہ پولیس افسر کے سامنے وہ الفاظ بتاتا جو اس نے بعد میں ملزم کی طرف منسوب کیے۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا اس لیے یہ کہانی فرضی ہے

۶: دیگر گواہوں کے بیانات میں اختلاف۔ دلوان وزیر چند کی شہادت پڑھ کر سناتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا کہ آپ فاضل جج صاحبان اس بات پر یقین کر سکتے ہیں کہ کدار ناتھ، وزیر چند کو

نہیں جانتا تھا۔ اگر اسے نام نہیں آتا تھا تو وہ کہہ سکتا تھا کہ کوئی آدمی وہاں موجود تھا۔ اس کے بعد گواہ بھگت سنگھ بھی تقریباً ایسی ہی کہانی سناتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ملزم کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ ہر ایک گواہ ان الفاظ کے متعلق جو ملزم نے کہے مختلف بیانات دیتا ہے۔ چنانچہ بھگت کے بقول ملزم نے کہا تھا "ہتھکڑیاں سونے کے کڑے ہیں"۔ نانک چند گواہ کا بیان ہے کہ ملزم کہتا تھا "راجپال میرا دشمن نہیں تھا۔ بلکہ میرے رسول کا دشمن ہے۔ گواہ سچار رند نے کم و بیش وہی الفاظ کہے جو نانک چند نے بیان کیے ہیں لیکن گواہ ودیارتن جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس نے ملزم کو گرفتار کیا۔ بالکل مختلف الفاظ بیان کرتا ہے (مسٹر جسٹس براڈوے گواہ نے پہلے کہہ دیا ہے کہ میں ملزم کے صحیح الفاظ بیان نہیں کر سکتا مگر اس کا ملخص بتا سکتا ہوں)

۷: آتما رام کباڑی بناوٹی گواہ ہے۔ میں صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ آتما رام کباڑی ایک سکھایا ہوا گواہ ہے۔ اسے اسی روز معلوم ہو گیا تھا کہ راجپال مارا گیا ہے۔ پھر شناخت کی پریڈ ہوئی۔ جس میں تین مرتبہ گھومنے کے بعد اس نے ملزم کو شناخت کیا۔ گو اس نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ ملزم کی ناک کے قریب ایک نشان ہے کیا کوئی چھریاں بیچنے والا اس قدر باریک بین ہو سکتا ہے کہ وہ اس بات کا بھی خیال رکھے کہ خریدار کی ناک کے پاس نشان بھی ہے۔ گواہ کا اپنا بیان ہے کہ ملزم کے کان میں دھاگا پڑا ہوا تھا۔ حالانکہ وہ ۷۸ سالہ بوڑھا ہے اس کی بینائی بھی اچھی نہیں۔ اسی گواہ کا بیان ہے کہ میں فروخت کی ہوئی چھریوں کو پہچان سکتا ہوں۔ لیکن بعد ازاں اس نے غلط چھری کو شناخت کیا (چھریاں عدالت میں موجود تھیں) فاضل وکیل مسٹر جناح نے ٹوٹی ہوئی نوک والی چھری کی طرف جج صاحبان کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ خود ان چھریوں کو دیکھ کر بتائیں کہ ان میں کیا تمیز ہو سکتی ہے کہ آتما رام یہ بتانے کے قابل ہو گیا کہ فلاں چھری ہے۔ ملزم کا اپنا بیان ہے کہ میں نے آتما رام کباڑی سے چھری نہیں خریدی۔ شناخت کے وقت جو طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ باوجود اس کے آتما رام کباڑی نے تین چکر لگانے کے بعد ملزم کو شناخت کیا۔ شناخت کے طریقے میں یہ ایک قابلِ غور نقص ہے۔

۸: خون کے نشانات کا مغالطہ۔ ایم اے جناح نے فرمایا سب انسپکٹر کی شہادت ہے کہ ملزم کی شلوار اور قمیض پر خون کے نشانات تھے۔ ملزم کا بیان ہے کہ میرے ساتھ تشدد کیا گیا۔ استغاثہ

نے کہیں بھی یقینی طور پر بیان نہیں کیا کہ ملزم کے کپڑوں پر خون کے جو نشانات تھے وہ اسی قتل کی وجہ سے تھے۔ طبی شہادت ہے کہ یہ نشانات شاید مقتول کے قریب آنے سے لگ گئے ہوں یہ امر واضح ہے۔ ملزم مقتول کے نزدیک نہیں آیا۔ اس میں شک نہیں کہ خون کے نشانات کسی انسان کے خون کے ہیں۔ لیکن یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ یہ مقتول کے خون کے نشانات ہیں اگر میری انگلی زخمی ہو جائے تو اس کے اندر سے بھی کافی خون نکل آئے گا۔ جس سے میرے کپڑوں پر بڑے بڑے نشانات لگ سکتے ہیں۔

۹: سیشن جج کا قابلِ اعتراض استدلال اس کے بعد مسٹر جناح نے کہا کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ فاضل جج نے فیصلے میں غلطی کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ دو ہندو اسیسر ملزم کو مجرم بتاتے ہیں لیکن دو مسلمان اسیسر اسے بے قصور ٹھہراتے ہیں اگر اس وقت ہندو مسلم فرقوں میں کشیدگی تھی تو فاضل جج کا فرض تھا کہ وہ اپنی رائے سے فیصلہ کرتا۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ ہندو اسیسروں کی رائے فرقہ پرستانہ نہ تھی اس کے علاوہ فاضل جج نے شہادتوں سے بھی غلط نتیجہ مرتب کیا ہے۔

۱۰: رحم کی استدعا۔ آخر میں مسٹر جناح نے کہا کہ ملزم نوجوان بچہ ہے۔ راجپال نے بدنام کتاب شائع کر کے مسلمانوں کے دلوں کو مجروح کیا تھا اس لیے سزائے موت سخت سزا ہے۔ اشتعال کے تحت جرم اور کم عمر کے لیے قانون میں سزا کی واضح رعایت ہے اس لیے ملزم پر رحم کیا جائے۔"

اس مدلل اور معقول تقریر کے جواب میں استغاثہ کے وکیل مسٹر جے لال کپور نے کہا۔

۱: ملزم واردات کے فوراً بعد خون آلود چھرے اور خون آلود کپڑوں کے ساتھ گرفتار ہوا ہے اس لیے یوں سمجھنا چاہیئے کہ وہ موقعہ پر ہی گرفتار ہوا ہے۔ قتل کے بعد ملزم کا فرار ہونا لازمی تھا وہ یا رتن کا ٹال مہاشہ راجپال کی دوکان سے صرف ایک فرلانگ ہے۔

۲: مقتول راجپال کے دو ملازم کدار ناتھ اور بھگت رام موقعہ پر موجود تھے۔ انہوں نے راجپال کو قتل ہوتے خود دیکھا۔ مگر انہوں نے ملزم کو پکڑنے کی اس لیے کوشش نہ کی کہ اس کی آنکھوں میں خون سوار تھا اور اس کے ہاتھ میں چھرا تھا۔ اگر وہ مزاحمت کرتے تو ایک کی بجائے تین قتل ہو جاتے۔ ملازم ہونے کی وجہ سے ان کے بیانات پر شک کرنا معقولیت نہیں ہے۔

۳: یہ درست ہے کہ ابتدائی رپورٹ میں کدار ناتھ نے بھگت رام کا نام نہیں لکھوایا مگر اس سے

کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رپورٹ درج کرانے کا مقصد پولیس کو واقعہ قتل کی اطلاع دینا تھی۔ تفصیلات اور جزئیات بعد میں پولیس اور عدالت کو بتائی جاتی ہیں۔

۴: یہ درست ہے کہ کتاب" رنگیلا رسول" میں بعض باتیں اسلامی عقائد کے خلاف ہیں۔ مگر مقتول اس کا صرف ناشر تھا مصنف نہیں۔ اس غرض کے لیے ناشر کے خلاف زیر دفعہ ۱۵۳ الف مقدمہ چلایا گیا تھا مگر ہائی کورٹ نے اس فعل کو کوئی جرم نہیں سمجھا ہے اور ملزم بری ہو گیا۔

۵: مزید براں اشتعال کے تحت سزا میں رعایت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ملزم کا اقدام فوری ہو، نہ کہ سالوں کے بعد یعنی جونہی کتاب چھپ کر آئی ملزم اس پر حملہ کر دیتا تو وہ اشتعال کی رعایت حاصل کر سکتا تھا۔ (اس پر مسٹر جناح نے جواب دیا کہ ہو سکتا ہے کہ ملزم کو اس کتاب کے مندرجات کا علم اسی روز ہوا ہو۔ جس روز اس نے حملہ کیا)

۶: چھری نئی یا پرانی کا کوئی سوال نہیں۔ یہ ایک آلہ قتل ہے۔ ہر نئی چیز استعمال کے فوراً بعد پرانی ہو سکتی ہے۔ چھری کو جس دن قتل کے لیے استعمال کیا گیا اس دن یقیناً وہ نئی اور تیز تھی۔ اس کے بعد چھ ماہ کا عرصہ زیر استعمال نہ رہنے کی وجہ سے زنگ آلود ہو گئی ہے اور مال خانے میں الٹنے پلٹنے کی وجہ سے اس کی نوک بھی شکستہ ہو سکتی ہے۔

۷: فوجداری طریقِ کار کے مطابق ملزم کی باقاعدہ شناخت پریڈ کرائی گئی تھی۔ اسے نہ صرف آتمارام نے بلکہ کدار ناتھ، نانک چند اور پرمانند نے بھی شناخت کیا تھا۔

۸: پیغمبر پر رکیک حملے کرنا واقعی افسوس ناک ہے۔ مگر تعزیرات ہند میں اس جرم کی کوئی سزا نہیں۔ عدالت کا کام ملزم کو مروجہ قانون کے مطابق سزا دینا ہے نہ کہ تعزیراتِ ہند میں ترمیم کرنا یا خود ایک نیا قانون بنانا۔

عدالت نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد حاضرین کو باہر نکال دیا۔ دیوان رام لال ایڈووکیٹ جنرل کے دلائل سنے بغیر غازی علم الدین کی اپیل خارج کر دی گئی اور عدالت ماتحت کا فیصلہ بحال رہا۔ ہائی کورٹ کا یہ فیصلہ جب غازی علم الدین کو اس شام جیل میں سنایا گیا تو ان کے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ چہرہ تمتما اٹھا اور وہ یہ شعر گنگنانے میں محو ہو گئے

بے تاب ہو رہا ہوں فراقِ رسول میں
اِک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام

○

اگرچہ مسلمان انگریز حکومت کے معاندانہ رویے سے دل برداشتہ تھے۔ مگر پریوی کونسل کے دروازے پر دستک دینے میں ایک خاص مصلحت کارفرما تھی۔ سید عطاء اللہ بخاری ابتداء سے مقدمہ بازی کے خلاف تھے۔ ان کی خواہش تھی علم الدین اور عدالت کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس معاملے میں رحم کی اپیل گناہ ہے۔ اقبالِ فعل سے انحراف ایک عظیم جرم ہے۔ اور علم الدین کو ایسی حسین موت کی آغوش سے چھین لینا ان کی ذات پر بہت بڑا ظلم ہے۔ لیکن سید حبیب شاہ اور علامہ اقبال کی رائے اس کے برعکس تھی۔ ان کا کہنا تھا یہ بجا ہے اپنے تئیں بے قصور ظاہر کرنا ناقابلِ عفو گناہ ہے اور غازی علم الدین کو ایسی مثالی موت جو حقیقت میں موت نہیں ہے۔ سے بچانا ایک عظیم ترین جرم ہے۔ لیکن اگر ہم خاموش بیٹھ کر حالات کے جائزے میں گم ہو جائیں تو غیر مسلم اس کا مطلب یہ اخذ کریں گے کہ علم الدین کا کوئی والی وارث نہیں ہے اور مسلمان اس سے کوئی خاص انس نہیں رکھتے۔ اس لیے حجت پوری کرنے کے لیے ہمیں ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی کرنا چاہئے کیونکہ علم الدین کسی ایک فرد کا نام نہیں پوری قوم کے تعارف کا معیار تھا۔ وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے ایک قابلِ فخر سرمایہ بن گیا تھا۔ چنانچہ پریوی کونسل لندن میں دائر کردہ اپیل کا مسودہ ایم اے جناح کی نگرانی میں تیار ہوا۔ جس میں غلط قانونی ضابطوں کی نشاندہی کی گئی۔ واقعات اور قانونی سقم کا بوضاحت تذکرہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں زور دیا گیا کہ فیصلہ کرتے وقت دفعہ ۱۵۳ الف کی وضاحت اور دفعہ ۳۰۴ جز و اشتعال انگیز قتل کو زیرِ غور رکھا جائے۔ قائدِ اعظم اس سے فارغ ہوتے تو پنڈت دیوان چمن لال ایم اے ایل ایل بی نے آپکو ایک پروقار ضیافت میں مدعو کیا۔ جس کے بعد جناح صاحب ۱۷ جولائی ۱۹۲۹ء کی رات بمبئی جانے کے لیے فرنٹیئر میل پر سوار ہو گئے۔ اواخر جولائی میں نامور وکلاء کی ساعی جمیلہ اور مسٹر فرخ حسین کی وساطت سے غازی علم الدین کا مرافعہ پریوی کونسل لندن میں دائر کر دیا گیا۔

یہ بات صاحب نقد و نظر کو کیا معلوم
وہ سرفراز ہی کب تھا جو دار پر نہ تھا

وہاں میاں طالع مند برطانیہ کے سابق وزیر اعظم لارڈ آکسفورڈ کے فرزند ائسٹر آرل الیکوئتھ کی خدمات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے الف ایل ولسن اینڈ کمپنی سولیسٹرز کو ان کے تقرر کے لیے لکھا اور پوچھا کہ وہ پیش ہونے کے لیے کتنی فیس لیں گے۔ لیکن پریوی کونسل نے کسی وکیل کو پیروی کرنے کی اجازت نہ دی اور صرف مسودے کے مطالعہ پر اکتفا کیا۔ فرنگی دور میں عدالتی آئین سازی کا سب سے بڑا اور قانون کا شارح ادارہ یہی تھا۔ اس عدالت نے اپیل کنندگان کے موقف کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ غازی علم الدین کی اپیل نامنظور کردی اور دفعہ ۱۵۳ الف کی وضاحت اور دفعہ ۳۰۴ کے جزو اشتعال انگیز قتل کے معاملے کو بھی گول کر گئی۔ اصل میں وہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو زیادہ خوش رکھنا چاہتی تھی۔

غازی علم الدین کے مقدمے میں پریوی کونسل تک جو اخراجات آئے ان کا کل تخمینہ اٹھارہ ہزار روپے ہے۔ وہ نہایت مہنگائی کا دور تھا۔ ابتدا میں آپ کے والد میاں طالع مند نے تمام مصارف خود برداشت کیے۔ ساڑھے تین ہزار روپے اپنی گرہ سے اور کچھ رقم قرض لے کر خرچ کی۔ مگر جب اس مقدمے نے شہرت پکڑی تو اسیرِ عشق سے وابستگی قومی وقار کا سوال ثابت ہوا اور غازی علم الدین عوام الناس کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ وہ نوعمر لڑکا جو کل تک گمنام تھا۔ چند دنوں میں اخباروں کے اولین صفحات کی سرخیوں کی زینت بن گیا۔ اب قید خانہ اور مقدمے کی پیشیوں میں ایک بے پناہ ہجوم ہوتا تھا۔ جس میں ہر طبقہ اور ہر عمر کے لوگ شامل ہوا کرتے۔ عورتیں، مرد، بوڑھے اور بچے ان کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے کچہری پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ قصہ مختصر اب یہ مقدمہ ایک فرد کا نہیں پوری قوم کا تھا۔ چنانچہ علم الدین ڈیفنس کمیٹی عمل میں آئی۔ جس کی تحریک پر قوم نے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ عوام الناس کے علاوہ خاص طور پر جن لوگوں نے مقدمے کے مصارف میں ہاتھ بٹایا ان میں قصور پورہ لاہور کے ارائیں (میاں فیملی) اور ضلع ساہیوال دیہہ کرپارہ کے کھگے سید زمان علی شاہ وغیرہم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آمد و خرچ کا حساب مولوی محمد عبداللہ کے سپرد تھا۔ جنہوں نے یہ فرض نہایت دیانت اور ذمہ داری سے سرانجام دیا۔ بقول شیخ رشید احمد صاحب کے مقدمے میں متعلقہ وکلاء نے خاص دلچسپی کا ثبوت دیا۔" انہوں نے غازی علم الدین کے لواحقین سے فیس وغیرہ کا کبھی کوئی مطالبہ نہ کیا۔ حتیٰ کہ وہ تھوڑے بہت متعلقہ اخراجات بھی خود اپنی

جیب سے برداشت کرتے رہے۔ اس سلسلے میں مسٹر فرخ حسین۔ میاں تصدق حسین خالد میاں فیروزالدین صاحب اور خواجہ نیاز احمد ایڈووکیٹ کے نام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ مسٹر ایم اے جناح نے بھی بڑے بھاری دلائل عدالت کے گوش گزار کیے۔ جن کی قدر و قیمت کوئی ماہر قانون دان ہی جان سکتا ہے۔ پیر دستگیر نامی نے رقم کیا ہے۔ وکیل دوستوں کا کام اخلاص پر مبنی نہ تھا۔ سیشن کورٹ میں پیروی کے لیے مسٹر سلیم ایڈووکیٹ نے چھ سو روپیہ فیس وصول کی۔ اس روایت کی تردید کرنا آسان نہیں۔ یہ سوچنا پڑتا ہے۔ اٹھارہ ہزار روپیہ آخر گیا کہاں! اکثر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ قانون دان طبقے میں ایثار عام نہیں اور اخلاص کمیاب ہے۔

○

ایم ایس ناز نے بحوالہ پروفیسر احمد سعید نقل کیا ہے کہ پروفیسر صاحب نے روزنامہ انقلاب ۲۰ جولائی ۱۹۲۹ء صفحہ ۳ کے حوالے سے تحقیق کے بہت سے گوشے اُجاگر کیے ہیں! وہ انکشاف کیا ہے "کہ پنجاب کے مشہور سیاسی رہنما اور وکیل سر محمد شفیع نے اس مقدمے کی پیروی کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا تھا کہ ہندو اسے بُرا سمجھیں گے"۔ حالانکہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ پروفیسر صاحب کو اس سلسلے میں غلطی ہوئی ہے۔ دراصل اس دوران ہندو اخبارات طرح طرح کے افسانے گھڑنے لگے تھے۔ یہ شوشہ بھی روزنامہ پرتاب نے ہی چھوڑا تھا۔ جس کی تردید کرتے ہوئے انقلاب نے "علم الدین، جناح اور پرتاب" کے عنوان سے اداریے میں لکھا "اگر سر شفیع کے پاس کوئی اور وجہ نہ تھی تو ہمارے خیال میں انہوں نے سخت غلطی کی ہے اور مسٹر جناح کی جرأت قابلِ قدر ہے"۔ اس میں قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ درج بالا نفسِ مضمون "پرتاب" کے جواب میں لکھا گیا کیونکہ ہائی کورٹ میں پیشی کے بعد ہندو ذرائع ابلاغ نے قائدِ اعظم اور مسلمانوں کی ہرزہ سرائی شروع کر دی۔ ہندو اخبارات نے اس موضوع پر کئی قابلِ اعتراض اداریے لکھے۔ پرتاب میں ان دنوں "چلنت" اور "گپ شپ" کے عنوان سے دو کالم چھپا کرتے تھے۔ جن کا حقائق سے دور کا تعلق بھی نہ ہوتا۔ اسی ایک کالم میں شائع ہوا تھا کہ سر شفیع ایک سنجیدہ شخصیت ہیں۔ انہوں نے علم الدین کا مقدمہ اس لیے نہ لیا تھا کہ ہندو اسے بُرا سمجھیں گے"۔ ان حاشیہ آرائیوں کا مقصد ہی یہ تھا کہ باہمی آویزش اور شکر رنجیاں جنم لیتی رہیں۔ اس اخبار نے یہاں تک لکھا "مسٹر جناح

کی قابلیت علم الدین کو موت کے منہ سے نہ بچا سکی۔ لہٰذا مسٹر جناح کو ایسا گز ور مقدمہ مطلقاً لینا ہی نہ چاہیئے تھا کیونکہ ہندوؤں کو ان کے خلاف ناواجب شکایات پیدا ہو گئی ہیں"۔ جب کہ ہائی کورٹ میں مسٹر محمد علی جناح رح کی تقریر اس قدر مدلل اور موثر تھی کہ اسے خصوصاً مسلم اور عموماً غیر جانبدار اخبارات نے "جناح کی باطل شکن تقریر" کے عنوان سے یاد کیا۔ اب یہ کہنا ناگزیر ہے کہ سر میاں محمد شفیع پر یہ الزام نہیں ایک عظیم بہتان ہے! اور پروفیسر احمد سعید صاحب "انقلاب" کی اس عبارت کا صحیح مطلب اخذ نہیں کر سکے۔ سر شفیع کی کوششوں پر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اگر ان کا عظیم کردار حذف کر دیا جائے تو عشق و محبت کی یہ داستان مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔

میرے چہرے پہ لکھی ہے تیرے غم کی تحریر
لوگ کیوں تجھ کو بھلا مجھ سے جدا جانیں گے

جناح صاحب کی تقریر اس قدر وزنی تھی کہ روزنامہ "الجمعیۃ" نے ۲۰ر جولائی ۱۹۲۹ء کے پرچے میں صفحہ ۴ پر لکھا "لاہور ہائی کورٹ سے بھی علم الدین کی اپیل کا فیصلہ صادر ہو گیا اور پھانسی کا جو حکم سیشن عدالت سے ہوا تھا وہی بحال رہا۔ قائد اعظم رح کی مدلل اور موثر تقریر کو پڑھنے کے بعد اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے دلائل کس قدر وزنی تھے اور انہوں نے ماتحت عدالت کی شہادتوں میں جن نقائص کا ذکر کیا۔ ان سے مقدمہ کس درجہ کمزور ہو گیا تھا۔ مگر ہائی کورٹ کے ججوں نے خدا معلوم کن وجوہ کی بنا پر ان دلائل کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ مسٹر جناح کی تقریر کے بعد پھانسی کی سزا کس طرح بحال رہ سکتی تھی"۔

حیران کن پہلو یہ ہے ہندو جرائد و رسائل نے غازی علم الدین کے متعلق کئی افسانہ طرازیاں شروع کر دیں۔ علم الدین کئی دنوں سے پریشان خاطر ہے اور بعض اپنے خاص صفحات ان لطیفوں کے حوالے کر دیتے کہ اب وہ اپنے فعل پہ پچھتا رہا ہے اور ہر وقت کف افسوس ملتا رہتا ہے۔ جناب وقار اللہ عثمانی پانی پتی ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے وہ غازی علم الدین سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے دل میں آپ کی بڑی قدر تھی انہی دنوں وقار اللہ عثمانی صاحب نے آپ سے کنج اسارت میں ملاقات کی اور اگلے روز ۴ ستمبر کو اپنا ایک مضمون انقلاب کے حوالے کیا۔ جس میں لکھا "کل تین بجے شام لاہور سنٹرل جیل میں غازی علم الدین صاحب سے ان کے والد کی معیت میں ملا۔ ماشاء اللہ خوش و خرم

ہیں اور نہایت اچھی صحت ہے۔ ہم نے بیس پچیس منٹ تک ملاقات کی۔ انہوں نے اتنی دیر جو بات کی ہنس کر کی۔ آزاد آدمیوں میں اتنا اطمینانِ قلب نہیں دیکھا، جتنا ان میں پایا گیا۔ ان کے والد نے کہا کہ اخبار "پرتاب" میں تمہارے متعلق لکھا ہے کہ بہت ہی کمزور ہو گئے ہیں اور ہر وقت مغموم و متفکر رہتے ہیں۔ یہ سن کر خوب ہنسے اور فرمایا کہ "یہ ان لوگوں کے خبثِ باطن کی علامت ہے وہ اپنی آگ میں خود جل رہے ہیں ورنہ جس کو یہ یقین ہو کہ موت کا مقررہ وقت اٹل ہے وہ اب آجائے یا بیس برس بعد، تو اس کو کیا غم کیسی فکر؟ ایڈیٹر اخبار خود آکر مجھے دیکھ جائے اور اپنے خشک شدہ زخموں کو تازہ کر جائے"۔ یہ بھی فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کل چودھری افضل حق صاحب اور مولانا ظفر علی خاں صاحب جیل میں آئے تھے۔ افسوس مجھ سے ملے بغیر چلے گئے۔ ہم نے کہہ دیا کہ اخباروں سے ہمیں تو مولانا کا جیل آنا معلوم نہیں ہوا اور اگر تشریف لائے ہوں تو علم نہیں۔

میاں صاحب کو کھانے پینے، نہانے دھونے اور وضو نماز کی کوئی تکلیف نہیں معلوم ہوا کہ جمعہ کے جمعہ روزہ رکھتے ہیں اور دیگر نوافل کا معمول ہے اور ہر وقت درود شریف کا ورد رکھتے ہیں۔

مافوق الفطرت مصدقہ واقعات

- عظمت کی ایک زندہ کہانی
- جیل کی وہ کوٹھڑی کیوں خالی ہے؟
- شہادت سے پہلے اور اس کے بعد

میں سمجھتا ہوں تیری عشق گری کو ساقی
کام کرتی ہے نظر، نام ہے پیمانے کا

گنبد خضریٰ تصورات کا مرکز بن جائے۔ اور نجف کی خاک جس کی آنکھ کا سرمہ ہو اس کے سیرت و کردار کی تصویر الفاظ کے آئینے میں کبھی بھی اتر نہیں سکتی۔ غازی علم الدین شہید کو جو مقام عطا ہوا ہے بلاشبہ وہ عقل و شعور سے ماوراء ہی ہے۔

غازی علم الدین شہید کی فضیلت رسمی براہین و دلائل کی محتاج نہیں۔ وہ اسلام کے ایک قابل فخر سپاہی ہیں شہادت کا اعلیٰ مقام خود ان کی شان و عظمت پر گواہ ہے مگر بعض لوگ ان کی شہرت و بلند پروازی کا سبب کچھ اور ٹھہراتے ہیں۔ ان کی نظر میں علم الدین خصوصاً اس لئے خوش قسمت ہیں۔ کہ قائد اعظم ان کے وکیل تھے قاری شمس الدین بخاری نے جنازہ پڑھایا مولانا ظفر علی خان نے اپنی خاص نگرانی میں قبر بنوائی اور حضرت علامہ اقبال مرحوم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے نعش کو لحد میں اتارا۔ میرا عقیدہ و خیال اس سے بالکل مختلف ہے اہل دل جانتے ہیں۔ غازی علم الدین شہید کے شرف و وقار کو مرقومہ اسباب سے ذرا بھی نسبت نہیں ہے بلکہ قائد اعظم کے ماتھے کا ستارہ چمکا کہ وہ قلب و نظر کے اس افسانے میں ملوث ہوئے اور ان کی زندگی زیب داستان بن گئی۔ حضرت علم الدین شہید کا نام تا قیامت زندہ رہے گا اور قائد اعظم کے لئے بھی تحسین و آفرین کی فراوانی رہے گی ان کے نامہ اعمال کے سرورق پر بابائے قوم کے ساتھ "وکیل علم الدین شہید" کے الفاظ بھی درج ہوں گے اور صرف اس لئے قیامت کے دن وہ بلا حساب کتاب جنت کے سزاوار ٹھہریں گے قاری شمس الدین بخاری قاضی ازل کے سامنے کہہ سکیں گے میں نے جنازہ کی نماز پڑھائی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں بھی شوخی قسمت سے چہک رہے ہوں گے کہ میں شہید رسالت کی قبر میں لیٹا تھا اور اقبال مرحوم کے لئے یہ کافی ہوگا کہ وہ شہید کا ثناخواں ہے اس نے کشتۂ خنجر تسلیم و رضا کے منور جسم کو چھوا ہے اسی شرف نے حضرت اقبال کو یہ بیباکی عطا کی۔

" اپنا گریباں چاک ، یا دامن یزداں چاک "

گنبد خضریٰ تصورات کا مرکز بن جائے اور نجف کی خاک جس کی آنکھ کا سرمہ ہو اس کے سیرت و کردار کی تصویر الفاظ کے آئینے میں کبھی بھی اتر نہیں سکتی غازی علم الدین شہید کو جو مقام عطا ہوا بلاشبہ وہ عقل و شعور سے ماوریٰ ہے زبان و کلام کی شوخیاں نیاز مندی کا درس دیتی ہیں اور علم و فن کی قوتیں یہاں جبہ سائی کرتی ہیں قرآن حکیم کا فیصلہ ہے کہ شہید زندہ ہوتا ہے مگر ہم شعور نہیں رکھتے۔ غازی علم الدین شہید کی حیات جاوید کا لمحہ لمحہ یادگار ہے۔ حاجی میاں نیاز احمد ایم اے کا کہنا ہے عرصہ اسیری میں غازی ممدوح کا حسن مزید

نکھر گیا تھا اور وہ داغ چھالے جو پیشے کے کام سے ہتھیلیوں پر ابھرے یکسر مٹ گئے اور ہاتھ سنگ مرمر کی طرح ملائم و شفاف ہو گئے اس مقام پر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ غازی علم الدین لکھنا پڑھنا جانتے نہ تھے اس وقت جیلوں میں بھی ان مشاغل پر ایک طرح کی پابندی ہوا کرتی ۔ لیکن وہ ملاقاتیوں کو قرآنی آیات پڑھ کر سنایا کرتے اور بڑے بڑے مشکل نکات فلسفیانہ انداز میں بڑی آسانی سے سلجھا دیتے انہیں پورا قرآن حفظ ہو گیا تھا ۔ خدا جانے انہیں یہ علم کون سکھا گیا ۔

"یہ فیضان نظر تھا ، یا کہ مکتب کی کرامت تھی"

غازی علم الدین نے لاہور کی جیل میں لواحقین کو بتایا کہ مجھے ایک سفید پوش نورانی بزرگ کی زیارت ہوئی ہے انہوں نے میرے سر پہ دست شفقت پھیرا اور فرمایا بیٹا ! مطمئن رہو تجھے جلد ہی بلا لیا جائے گا ۔ اس دن سے مجھے کمال درجہ سکون قلب میسر ہے ۔

سید احمد شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور شیخ خورشید ان دنوں میانوالی جیل میں بطور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ متعین تھے ۔ ان کا بیان ہے ایک رات ہم سپرنٹنڈنٹ کے ہمراہ جیل میں گشت کر رہے تھے کہ غازی علم الدین شہید کی کوٹھڑی سے ایک خاص قسم کی روشنی نظر آئی جس سے ہم بہت متاثر ہوئے اور خدا کے حضور میں سربسجود ہو گئے ۔ سید انتخار احمد شاہ (بخاری) کا اپنے والد سید احمد شاہ کے حوالے سے کہنا ہے اس قسم کے خوارق العادت سینکڑوں واقعات کا ظہور ہوا ۔ انہوں نے ہزاروں قیدی دیکھے ۔ مگر اس قسم کا باعظمت ، پر وقار اور عجیب و غریب شخص زندگی بھر نہیں دیکھا

شہادت سے قریباً ایک ہفتہ پہلے کا ذکر ہے میاں طالع مند کی میانوالی اسٹیشن پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے ملاقات ہوئی ۔ شاہ صاحب نے فرمایا "میاں صاحب ! شہادت کے روز جانے کتنے غوث ، قطب ، ابدال اور شیوخ عظام تشریف لائیں گے ۔ اس لئے رونے پیٹنے سے گریز کرنا ۔"

غازی علم الدین سے آخری ملاقات کا حال نہایت پر سوز ہے لواحقین رو رہے تھے مگر آپ مسکرا کر ان کو تسلی دیتے آپ نے میاں محمد الدین کی اہلیہ سے فرمایا " بھا بی تو کہتی تھی ۔ میں اپنے لخت جگر کو تیرا ہم زیب (رشتہ بالا) بناؤں گی اب تیرا وہ وعدہ کیا ہوا " ؟ بے اختیار موصوفہ کی زبان

سے نکل گیا "میں وعدہ ضرور نبھاؤں گی" آپ کی شہادت کے تھوڑی مدت بعد نور احمد کا انتقال ہو گیا اور وہ سر کی طرف مدفون ہے۔ اس طرح وہ آج بھی ہم زیب بنا ہوا ہے اور حور و ملائک دولہا کے گلے میں ہار ڈال رہے ہیں۔ غازی علم الدین کی روحانی طاقت کے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی قائل تھے جو شخص ذرا بیمار ہوتا۔ آپ اسے دو گھونٹ پانی اپنے ہاتھ سے پلا دیتے اور وہ خدائے کریم کی مہربانی سے فوراً شفایاب ہو جاتا۔ آپ کے کمرے کے باہر برآمدے میں پانی کا ایک گھڑا پڑا رہتا کہتے ہیں اس پانی کو پی کر سینکڑوں لوگ ہر روز سرمدی لطف حاصل کرتے ۲۲ مئی ۱۹۲۹ء کو غازی موصوف کا وزن ۱۲۸ پونڈ تھا اور شہادت کے دن ان کا وزن ۱۴۰ پونڈ کے قریب تھا اس قیدی اور دیگر مجرموں میں از حد تضاد واقع ہوا ہے عام طور پر موت کی سزا سن کر لوگ حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ اور غم واندوہ کی وجہ سے سوکھ کر کانٹا ہو جاتے ہیں مگر غازی موصوف کی کیفیت کچھ اور تھی کمال صبر و استقلال چہرے پر رونق اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی اور شب و روز ان کے جسمانی وزن میں اضافہ ہوتا رہا۔

میاں مہر دین غازی علم الدین شہید کے قریبی رشتہ دار تھے مگر نابینا ہونے کے سبب وہ آپ سے کہیں ملاقات نہ کر سکے آپ نے وصیت فرمائی کہ میرے اقربا میں جو شخص سب سے پہلے داعئ اجل کو لبیک کہے۔ اسے میرے دائیں جانب دفن کیا جائے۔ لہذا سب سے پہلے میاں مہر دین کا انتقال ہوا اور حسب وصیت سپرد خاک کئے گئے۔ شوخی قسمت کا کیا کہنا ایک ملاقات کی حسرت جس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہی وہی خوش قسمت سب سے پہلے ہم مدفن ٹھہرا۔

۳۰ اکتوبر کو جب غازی موصوف سے عزیز و احباب ملنے گئے تو انہیں جیل والوں سے معلوم ہوا کہ آج جناب علم الدین غازی صاحب بہت ہی خوش ہیں عزیزوں نے جا کر سبب پوچھا۔ تو آپ نے فرمایا "مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دیدار نصیب ہوا ہے جو کہ خواب میں ملے اور خوش خبری سنائی۔ اے علم الدین! تجھے مبارک ہو رب غفور نے تیری قربانی قبول فرمائی ہے اور نبی آخر الزماں کے دربار میں تیرا تذکرہ کثرت سے ہوا کرتا ہے میں اس پر خوش ہوں کہ عنقریب دربار رسالت مآب میں پہنچ جاؤں گا"

غازی علم الدین شہید کی اپیل جب پریوی کونسل سے خارج ہوئی تو جیل کا ایک ملازم اس

کی خبر پہنچانے کے لئے آپ کے پاس آیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ غازی موصوف بول پڑے اور فرمایا "تم مجھے یہ خبر دینے آئے ہو کہ اپیل خارج ہو گئی ہے پرسوں جب یہ فیصلہ ہوا مجھ کو اس وقت کا علم ہو چکا ہے"۔ وہ ملازم دوڑا ہوا اپنے دفتر گیا اور حیرت و استعجاب سے کہنے لگا "علم الدین غازی! کوئی عام قیدی نہیں ہے"۔ یہ سن کر جیل کے اعلیٰ ارکان اس کا منہ تکنے لگے اور پھر کسی گہری سوچ میں کھو گئے۔

غازی علم الدین کو جب میانوالی جیل میں پھانسی دینے کے بعد اس کے جسم خاکی کو مسلمانان لاہور کے سپرد کر دیا گیا۔ جنازے کا یہ روح پرور منظر آج تک انڈو پاکستان کی تاریخ میں ایک انفرادی حیثیت کا حامل ہے نماز جنازہ لاکھوں فرزندان توحید نے یونیورسٹی گراؤنڈ میں ادا کی اور قبرستان میانی صاحب میں دفن کر دیا گیا

دوسرے روز ایک بہت بڑا تعزیتی جلسہ عام چوک رنگ محل میں منعقد ہوا پہرہ دار امام الدین نے اشک بار آنکھوں اور گھبرائی ہوئی آواز میں جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ جب غازی علم الدین شہید کو سزائے موت کے حکم کے بعد میانوالی جیل کی کوٹھڑی میں رکھا گیا تو میں پہرے دار کے طور پر وہاں متعین تھا وہاں آخری رات جس کی صبح علم الدین کو پھانسی پر لٹکایا جانے والا تھا رات گئے کئی آوازیں آتی تھیں جیسے بہت سے لوگ باتیں کرتے ہیں۔ میں بوکھلا سا گیا اور غازی علم الدین سے دریافت کیا کہ تم کس سے باتیں کر رہے تھے جواب ملا، کوئی نہیں تھا، میں غصے میں (میرے منہ میں خاک) نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ صبح چھ بجے غازی علم الدین کو پھانسی دی جانی تھی دو اور تین بجے کے درمیان کیا دیکھتا ہوں کہ ایک روشنی کی لہر آئی جس نے میری آنکھوں کو چندھیا دیا بلکہ میری آنکھیں روشنی کے سامنے نہ ٹھہر سکیں اور بند ہو گئیں۔ پھر وہ روشنی اچانک غائب ہو گئی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کوٹھڑی سے غازی علم الدین بھی غائب اور روشنی بھی غائب، میں غم سے نڈھال ہو گیا اور رونے لگا کہ اب تو غازی کے بجائے انگریز مجھے پھانسی پر لٹکا دیں گے صبح چار بجے پھر وہی روشنی نمودار ہوئی اور جب میں نے کوٹھڑی کی طرف دیکھا تو غازی علم الدین موجود تھے میں روتے روتے ان کے پاؤں پر پڑا اور میری ہچکی بندھ گئی۔ مجھے خدا کے لئے معاف کر دیں میں نہ جانے تمہیں کیا کیا کہتا رہا۔ غازی علم الدین نے کہا: بزرگو، میں نے آپ کی باتوں کا بالکل برا نہیں مانا، اللہ تمہیں

سلامت رکھے اور خوش رکھے۔ امام الدین نے کہا بیٹا، آپ نے وہ کام کیا جو کوئی نہیں کر سکتا تم پر اللہ رسولؐ کا سایہ ہے بیٹا۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں مجھے بتاؤ تم کہاں گئے تھے۔ غازی علم الدین نے کہا میں تو یہیں پر تھا۔ میں نے پھر کہا تمہیں نبی آخر الزماں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے کر کہتا ہوں مجھے بتلا دو۔ غازی علم الدین آخر کار بتا دینے پر مجبور ہو گئے اور کہنے لگے، بزرگو سنو! حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ آئے اور مجھے اپنے ہمراہ لے گئے ایسے مقام پر جہاں میں کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں پہنچا تھا اور میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو میں بیان کر سکوں وہاں پر مجھے رسول عربی کی خدمت اقدس میں پیش کیا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور فرمایا! اب تم آزادی چاہتے ہو تو اپنے آپ کو آزاد سمجھو اگر تا قیامت عزت بھی چاہتے ہو تو پھر وہاں پہنچا دیا جائے لہٰذا میری مرضی پر علی مرتضیٰ یہاں چھوڑ گئے ہیں۔

روزنامہ "امروز" سے ماخوذ (پہریدار کا نام امام دین نہیں نواب دین ہے)

O

جن دنوں غازی علم الدین شہیدؒ میانوالی جیل میں پھانسی کے منتظر تھے اس دوران میانوالی کے سپرنٹنڈنٹ پولیس سید نور حسین شاہ تھے اس وقت کے ڈپٹی کمشنر راجہ زمان مہدی خاں نے اسی کے مشورے سے شہید کو لاوارثوں کے قبرستان میں دفن کیا اور پر امن ہجوم پر سنگ باری کرائی جہلم شہر کے باشندے جانتے ہیں۔ اس کا انجام بڑا عبرت ناک ہوا۔ اس کی اہلیہ پر بلیاں پالنے کا جنون سوار ہو گیا اور وہ روز و شب اسی کھیل میں مستغرق رہتی۔ اس کا بیٹا بھی جو پولیس میں ایک اعلیٰ افسر تھا۔ مخبوط الحواس ہو کر مرا اور خود ایس پی مذکور نے موت کے پنجۂ ظالم میں تڑپ تڑپ کر جان دی۔ لوگوں نے غازی علم الدین کی یہ پیشگوئی بھی پوری ہوتی دیکھی۔ کہ میت کے حصول میں دشواریاں پیش آئے گی اور جب مجھے لحد میں اتارا جائے گا تو رم جھم ہو رہی ہوگی۔

اللہ کے بندوں کی زندگی ایک نمونہ ہوتی ہے اور ان کی موت ایک درس، لوگ ان سے ہر حالت میں اکتساب فیض کر سکتے ہیں تیرہ دن گزرنے کے باوجود جب شہید علم الدین کی نعش گڑھے سے نکالی گئی۔ تو تعفن پیدا ہوا تھا نہ کوئی گزند پہنچی اس سے متاثر ہو کر بہت سے غیر

مسلم حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ جن میں میانوالی ہسپتال کا ایک سکھ سول سرجن بھی شامل تھا جو بعد ازاں لندن میں مقیم ہوگیا۔

یوں تو درجنوں ایسے واقعات ہیں جنہیں قلمبند کرنے کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے مگر بعض نہایت ضروری ہیں۔ میاں علم الدین کی جدائی کے غم میں ان کی والدہ اکثر پریشان حال رہا کرتی تھیں۔ ایک رات شہید موصوف اپنی پڑوسن چراغ بی بی کو خواب میں ملے اور فرمایا "میری والدہ ماجدہ سے کہہ دینا وہ رویا نہ کرے میں جلد ہی گھر آجاؤں گا"۔ اس کے دو تین دن بعد آپ کے حقیقی بھتیجے شیخ رشید احمد صاحب کی ولادت ہوئی اس واقعہ کا قابل ذکر پہلو یہ ہے۔ ولادت ہفتے کے روز اڑھائی بجے ہوئی۔ مکان بھی وہی تھا جس میں غازی صاحب نے خواب دیکھا یہ تمام علامات اس دن سے مطابقت رکھتی ہیں۔ جس روز آپ راجپال کو قتل کرکے گرفتار ہوئے۔

خدا جانے کیا بات تھی شہید مرحوم نے ایک موقع پر فرمایا "میرے سابقہ دوستوں دینا پان فروش اور حاجی صدیق کا انجام اچھا نہ ہوگا"۔ اس دن سے دینا تو ایسا غائب ہوا ہے کہ کوئی خبر نہیں۔ جانے وہ کس دیس جا بسا ہے اور کہاں روپوش ہوگیا۔ حاجی صدیق ابتدائی چند برس تو غائب رہا۔ پھر آبائی محلے سریانوالہ میں واپس آگیا ایک مدت بعد وہ بیمار ہوا اور بستر مرگ پر پڑ کر اس نے سسک سسک کر جان دی۔ چند گھنٹوں تک تو اس کے مرنے کی کسی کو بھی خبر نہ ہوئی۔ بعد ازاں اس کی میت میں تعفن کے آثار پیدا ہوئے اور محلے والوں نے اسے سپرد خاک کر دیا۔

غازی علم الدین نے آخری ملاقات کے دوران اپنی والدہ محترمہ سے گزارش کی "ماں میرے بعد مت رونا دھونا۔ اگر آپ یا مزمل کا ورد کیا کریں گی تو ہماری ہر ہفتے ملاقات ہوا کرے گی"۔ پھر جب تک موصوفہ بقید حیات رہیں، بذریعہ خواب باقاعدہ سلسلہ ملاقات جاری رہا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ غازی علم الدین شہید کو پھانسی دینے والے جلاد کا چہرہ موت کے بعد مسخ ہوگیا۔ پچھلے دنوں مشرق میگزین رپورٹ ریاض بٹالوی میں پیشہ ور جلاد تارا مسیح کے تاثرات شائع ہوئے۔ بقول اس کے ناموس رسالت کے پروانے اور عاشق رسول غازی علم الدین

شہید کو میانوالی جیل میں پھانسی دینے والا اس کا چچا حسن دین تھا۔ حسن دین پھانسی دینے کے چند روز بعد بڑے کرب اور اذیت کی موت مرا، اور مرنے کے بعد اس کی شکل بری طرح مسخ ہو گئی۔

جیل کی وہ کوٹھڑی جس میں غازی موصوف کو بند رکھا گیا۔ اس کے ساتھ بھی چند نہایت دلچسپ اور ایمان پرور حکایات وابستہ ہیں۔ غازی علم الدین کی شہادت کے بعد اس میں کوئی مستقل قیدی نہیں رکھا جا سکا۔ جانے کیوں اس میں بلا کی تپش ہوتی ہے۔ جس سے انسان کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ پسینے میں شرابور ہو جاتا ہے ایک عرصے تک جمعہ کی شب سنگ باری کی آوازیں بھی سنائی دیا کرتی تھیں۔ ڈر کے مارے قیدی بھی زور زور سے چیخنے لگتا۔ مگر ظاہراً سنگ پارے دکھائی نہیں دیتے تھے اسی وجہ سے اب جیل کے حکام اسے گودام کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ سینکڑوں قیدیوں نے اس روایت کو بیان کیا اور جیل کے وارڈن بھی مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔

یہ قصر حسن ہے آتش کدہ محبت کا
بجائے شمع یہاں دل جلائے جاتے ہیں

دیوانگان عشق کے دستور نرالے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ الٹی ہی چال چلتے ہیں گردن جھکا کر اپنے دوست کی تصویر دیکھتے ہیں اور کبھی وہ دیدار کے لئے آنکھوں کو بند کر لیتے ہیں۔ راقم بھی بار بار غازی علم الدین شہیدؒ کی آرام گاہ پر حاضر ہوا۔ جلوہ جاناں کے لئے ایک دفعہ میں نے بھی آنکھیں بند کیں اور چشم باطن سے سر تا پا .....

مشتاق دید کیلئے اب بھی صلائے عام ہے

تختہ دار پر کیا ہوا؟

- حضرت غازی علم الدین میانوالی میں
- نورانی صورت مہمان بزرگ کون تھے؟
- مہکتے سانسوں کی داستان
- ملت اسلامیہ کا ہیرو لاوارثوں کے قبرستان میں

ہے جس کی خلوتوں کا سہارا غمِ رسولؐ
وہ گوشۂ لحد میں بھی تنہا نہیں ہوا

اب تاریکی کی جگہ نور و نکہت کا ایک سیل رواں تھا۔
میں نے دیکھا کہ غازی علم الدین خشوع و خضوع سے ایک
مصلے پر بیٹھے، نظریں اوپر اٹھائے، خاموشی کی زبان میں
کسی سے محو گفتگو ہیں۔

پریوی کونسل لندن کا فیصلہ ایک بجلی تھا جس کی آمد سے امیدوں کے خرمن سے دھواں اٹھنے لگا فصل امید کو یوں جلتا دیکھ کر مسلمان سخت جوش میں آگئے چونکہ پریوی کونسل آخری عدالت تھی اس کے فیصلے کا مطلب یہ ہوا غیر مسلم جو چاہیں کرتے رہیں اس سلسلے میں ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہو سکتی اور مسلمان اپنے نبی آخرالزماں کی عزت و ناموس کا تمسخر خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہیں اس لئے لاہور میں کہرام مچا ہوا تھا فرزندان اسلام سخت اشتعال میں تھے اور ہر مسلمان کے دل میں یہی آرزو مچل رہی تھی کہ کسی طرح وہ بھی علم الدین بن جائے اس فضا سے حکومت کو اندیشہ لاحق ہو گیا کہ کسی وقت بھی غضب و طیش کی یہ چنگاری شعلے میں بدل کر سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے غازی علم الدین کو لاہور میں پھانسی دینے کی راہ میں مسلمانوں کے غیظ و غضب کی کیفیت ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی انگریز کو ڈر تھا کہ مسلمان لاہور میں ہرگز پھانسی نہ دینے دیں گے اور یہ قوم اپنے اس جانباز کے خون کے ایک ایک قطرے پر اپنی لاشوں سے حرمت و جواں مردی کے پر شکوہ محل بنائے گی چنانچہ حکومت نے اس خدشہ کے پیش نظر علم الدین کو مرکز سے دور میانوالی جیل میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا انگریز کے بعض زر خرید غلام بھی اس معاملے میں ملوث ہیں میانوالی علاقہ کے اکثر رئیسوں نے حکومت کو یقین دلایا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ نہیں ہو سکتی ۳ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ساڑھے نو بجے شب سنٹرل جیل لاہور سے آپ کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس، دو سارجنٹ اور چار سپاہیوں کی حراست میں بذریعہ موٹر کار پہلے گوجرانوالہ بھیجا گیا اور وہاں سے ساڑھے بارہ بجے رات کی گاڑی میں میانوالی روانہ کیا گیا آپ ۴ اکتوبر کو صبح سویرے فسٹ کلاس کے ڈبے سے اترے اور پولیس کی حراست میں میانوالی جیل میں داخل ہوئے لواحقین میں سب سے پہلے آپ کے والد محترم میاں طالع مند نے علی الصبح میانوالی شہر میں قدم رکھا اور ایک مسجد میں نماز ادا کی وہاں امام مسجد نمازیوں سے خطاب کر رہے تھے کہ "رات کو یہاں ایک مسافر پہنچا ہے خدا جانے وہ کس مصیبت میں گرفتار ہے دعا کریں کہ خدائے قدوس اس کی پریشانیاں دور فرمائے" میاں طالع مند کے بعد دیگر لواحقین اکثر رشتہ دار اور دوست بھی وہیں پہنچ گئے لوگوں کا بیان ہے میانوالی

شہر میں مدت سے ایک مجذوب رہتا تھا جو کسی سے کبھی کوئی بات نہ کرتا مگر جب غازی علم الدین میانوالی جیل میں منتقل ہوئے اس رات مجذوب گلی کوچوں میں دوڑتا پھر رہا تھا اور بلند آواز سے نعرے لگاتا ہوا اعلان کرتا "میانوالی کے لوگو تمہیں مبارک ہو تمہارے پاس ایک عاشق رسولؐ آرہا ہے" پھر وہ تالیاں پیٹتا، قہقہے لگاتا اور دوسرے بازار میں چلا جاتا وہ رات اس نے یوں ہی گزار دی اور سپیدہ سحر طلوع ہونے سے پہلے ایسا روپوش ہوا کہ آج تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

○

یوں تو ہر ایک مسلمان غازی علم الدین پر جان چھڑکتا تھا خصوصاً میاں نیاز احمد ایم اے گرین ہوٹل کراچی کے مالک ملک منظور الٰہی، سریانوالہ محلہ کے نیاز محمد کمبوہ اور تاجدین بٹ جوٹ آپ کے خاندان کے ہر دکھ سکھ میں برابر کے شریک تھے ان کے آپ سے دوستانہ مراسم بھی تھے یہ چاروں اصحاب زیادہ دن میانوالی میں ہی ٹھہرے رہے اور صبح و شام غازی علم الدین کی ملاقاتوں سے مستفیض ہوا کرتے غازی موصوف کے ہمسائے مہر دین کی دختر سعیدہ زینب بی بی (مرحومہ) نے بھی عسرت کے وہ دن آپ کے گھر والوں کے ساتھ میانوالی میں ہی گزارے پنجابی کے مشہور شاعر نیاز بھکھی صاحب نے بھی چند دن میانوالی میں ہی ڈیرہ جمائے رکھا ان کے علاوہ بھی ہزاروں ملاقاتیوں نے "محسن انسانیتؐ" کے اس فداکار نظارہ کیا ہر روز سینکڑوں افراد دیدار کے لئے جیل پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ان دنوں راجہ زمان مہدی خان میانوالی کے ڈپٹی کمشنر تھے جو انتظامات کا جائزہ لینے جیل میں تشریف لائے اور اسلام کے اس جسور و غیور فرزند سے ملاقات کی راجہ صاحب نے آپ کو اس جرأت مندانہ اقدام اور سزائے موت کے حکم کو سن کر صبر و استقلال کا ثبوت دینے پر مبارکباد پیش کی اس پر غازی علم الدین نے مسکراتے ہوئے کہا "قتل کے ملزم عموماً کئی کئی سال حوالاتوں اور جیلوں میں پڑے سسکتے رہتے ہیں لمحہ لمحہ کی موت مر کر تب کہیں وہ قید حیات سے آزاد ہوتے ہیں خدائے ذوالجلال کا خاص کرم شامل حال ہے کہ صرف چھ ماہ اور نو دن کے اندر اندر میرے مقدمے کے تمام مراحل طے ہو گئے ہیں۔ اور اب مجھے واصل بحق ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا میری دلی خواہش ہے کہ میں جلد سے

حلقہ بارگاہ رسالت میں حاضری دی، ڈپٹی کمشنر راجہ زمان خاں کا بیان ہے کہ آپ کی زیارت کر کے دل پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جی چاہتا تھا کہ رحمۃ العالمین کے لاڈلے غلام کی طرف دیکھتے اور محبوب خدا پر درود و سلام پڑھتے رہیں"۔

وہ آنکھوں میں آئے وہ دل میں رہے
رقیبوں کو کیسے خبر ہو گئی

غازی علم الدین کے مقدر کا ستارا افق پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا بڑے بڑے صاحب کمال اور عارف آپ کا نظارہ کرنے کے لئے کھچے چلے آ رہے تھے۔ سیال شریف کے سجادہ نشین صاحبزادہ حضرت محمد ضیاء الدین بھی وفور شوق سے مغلوب زیارت کرنے کے لئے میانوالی پہنچے۔ پیر صاحب غازی علم الدین کے جلال و جمال سے اتنے مرعوب ہوئے کہ آپ سے کوئی بات کرنے کا یارا نہ پا سکے البتہ سورۃ یوسف کی تلاوت کرنے لگے آپ حالانکہ اچھے قاری اور حافظ قرآن تھے مگر اس دن جانے کیوں زبان میں لکنت آ رہی تھی اور وفود جذبات کی وجہ سے بار بار رک جاتے تھے اس پر غازی علم الدین نے کہا "آپ بسم اللہ پڑھ کر ایک دفعہ پھر سے شروع کریں"، چنانچہ آپ دوبارہ پڑھنے لگ گئے مگر روانی اب کے بھی نہیں تھی، اکثر گلوگیر ہو کر رک جاتے آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں اور وہ ہر لمحہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتے تھے غازی صاحب جو قاری یا حافظ قرآن نہ تھے۔ اور قرآن ناظرہ بھی آسانی سے نہیں پڑھ سکتے تھے انہیں سورۃ یوسف بھی پہلے ہرگز یاد نہ تھی پیر صاحب کو صحیح لقمے دیتے رہے پیر سیال جب ملاقات کر کے باہر آئے تو فرط حیرت و استعجاب کی وجہ سے بول نہیں سکتے تھے صرف اتنا ہی فرمایا "میں علم الدین کے لبادے میں کوئی اور ہستی پاتا ہوں وہ لوگ نور بصیرت سے محروم ہیں جو آپ کو ان پڑھ اور جاہل کہتے ہیں انہیں علم لدنی حاصل ہے اور وہ کائنات کے تمام رموز و اسرار سے واقف ہیں"

پنجابی ادب کے حلقے میں استاد شاعر حضرت عشق لہر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں آپ مسلم لیگ کے ایک سرگرم رکن اور انقلاب کے مشاق شاعر تھے آپ کے غازی موصوف کے خاندان کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے ان کی غازی علم الدین سے آخری ملاقات ۱۳ اکتوبر

۱۹۲۹ء کو جیل میں ہوئی جو تاریخی لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے ان کا بیان ہے غازی کی شہادت میں صرف ایک دن باقی تھا موت لمحہ بلمحہ دروازے پر دستک دے رہی تھی اس کے باوجود میں نے نبی آخر الزمان ؐ کے فداکار کو بے حد مسرور اور مطمئن پایا ہاں وہ واصل بحق ہونے کے لئے بے قرار بھی تھے"۔

مرا راز کہ اندر دل نہاں است نہ وعظ است
بر منبر نہ تواں گفت و بر دار تواں گفت

غازی علم الدین نے استاد عشق لہر سے فرمائش کی کہ آپ میرے حسب حال کچھ اشعار سنائیں استاد سخن نے بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "سناؤں گا اور ضرور سناؤں گا مگر میں آج کے دن پہلے کچھ آپ سے سننا چاہتا ہوں" اس پر غازی علم الدین نے فارسی کے یہ اشعار مستانہ لہجے میں پڑھ کر سنائے

من عاشق سرمستم از دار میندیشم
پروانہ جان بازم از ناز میندیشم
چوں طالب دیدارم از اغیار چہ دارم
چوں عاشق گلزارم از خار میندیشم
باد دست چو مشغولم دشمن چہ کند برمن
چوں گنج بدست آمد از مار میندیشم
من دار بلائش را چوں تخت شہی دانم
حلاج و ہم عاشق از دار میندیشم

غازی علم الدین گو ناخواندہ تھے لیکن انہیں اس طرح کے بہت سے شعر یاد تھے ان فارسی اشعار کے بعد آپ نے انہی کا اردو منظوم ترجمہ مسحور کن آواز میں سنایا کہ فرطِ محبتِ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں انسان آبدیدہ اور شجر و حجر سربسجود ہو گئے۔

جب عاشق سرمست ہوں، میں دار سے ڈرتا نہیں
جان باز پروانہ جو ہوں، میں نار سے ڈرتا نہیں

میں طالب دیدار ہوں، اس کا نہیں غم مجھے
جب عاشق گلزار ہوں میں، خار سے ڈرتا نہیں
مشغول ہوں میں دوست سے دشمن کا اندیشہ نہیں
حاصل خزانہ ہو گیا، میں مار سے ڈرتا نہیں
پھانسی کا تختہ واسطے میرے ہے اک تخت شہی
ہاں عشق میں حلاج ہوں میں دار سے ڈرتا نہیں

آپ سے ایسا پر سحر کلام سن کر استاد عشق لہر پر کافی دیر جذب و مستی کی کیفیت رہی آخر آپ نے سر اٹھا کر آہستہ سے پوچھا " اے فخر دین و ملت! اے پروانہ شمع رسالت! آپ کی کوئی آخری خواہش "! اس پر آپ نے جھٹ فرمایا " میرے دل میں صرف یہی ایک تمنا ہے کہ یہ ناپائیدار رشتہ حیات کہیں جلد از جلد ٹوٹ جائے تاکہ مضطرب روح جسد خاکی سے رہائی پا کر اپنے حقیقی خالق سے جا ملے آپ تو شاعر ہیں اور خوب جانتے ہیں۔

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

واقعی! انتظار کی گھڑیاں بڑی صبر آزما ہوتی ہیں ان کی طوالت کو تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ضیاء الدین ایسے ماہر ریاضیات بھی نہیں ماپ سکے اور عشق کے رنگ بڑے انوکھے ہوتے ہیں دیکھیے بن مریضِ عشق کو لقمانِ زمانہ کی چارہ گری سے بھی کچھ افاقہ نہیں ہوتا۔

از سر بالین من برخیز اے ناداں طبیب
درد مند عشق را دارو بجز دیدار نیست

اس کے بعد غازی علم الدین کی فرمائش پر استاد عشق لہر نے ذیل کے پنجابی اشعار فی البدیہہ اپنی خاص لے میں پڑھے۔

علم الدین! محمدؐ دے نام اتوں، میاں جان جوانی نوں واریائی
آفرین غازی! تیرے حوصلے دا، راجپال کمبخت نوں ماریائی

جھیڑا چکیا بوجھ محبتاں دا، چڑھکے وار تے سروں اتار پائی
بیڑا ڈوب کے نبیؐ دے دشمناں دا علم الدین توں گل نوں تار پائی

ان اشعار سے غازی علم الدین بہت خوش ہوئے اور فرمایا آپ مجھے کچھ اور شعر سنائیں جس پر استاد عشق لہر تے غازی کے حال مطابق فی البدیہہ یہ پنجابی رباعی سنائی

وِچ چودھویں صدی دے ہو یار روشن تیرا عشق عاشق حضور دیا
جھوٹا دار دی پینگھ تے جھوٹیا ای شوق نال ساتھی منصور دیا
سب دی اکھیاں وِچ سما گیا ایں، علم الدین توں ذرہ یا طور دیا
عشق لہر دی عرض دربار رسولؐ اندر پہلے کریں مسافر دور دیا

ابوالافضل پیر غلام دستگیر نامی نے اپنے پمفلٹ میں غازی علم الدین شہید اور استاد عشق لہر کی تاریخی ملاقات پر بڑی روشنی ڈالی ہے وہ رقمطراز ہیں کہ عشق لہر کا حقائق پر بنی کلام سن کر غازی موصوف بڑے خوش ہوئے ان کا چہرہ اور بھی شگفتہ ہو گیا اور طبیعت بے حد ہشاش بشاش ہو گئی۔ استاد عشق لہر کے کلام سے متاثر ہو کر آپ نے فرمایا اے استاد عشق لہر آپ کی صحبت سے مجھ میں مزید کیف، جذب اور مستی پیدا ہو گئی ہے اور کچھ خیالات کلام موزوں بن کر میرے ہونٹوں پر آ رہے ہیں اگر اجازت ہو تو سنا دوں استاد عشق لہر کے اشتیاق پر غازی ممدوح نے مستانہ لہجے میں اپنے تاریخی اشعار پڑھ کر سنائے جن کا ایک ایک حرف تاریخ اسلام میں جلی حروف سے لکھا جائے گا۔

دن ہفتے دا ایں قربان جاواں اللہ بخشی سی ایہہ مراد مینوں
قسم رب دی بندہ نہ نال کوئی، مدد دتی سی اللہ جلال مینوں
خنجر ماریا سی حکم رب دے نال ایہو دل دے وچہ مراد مینوں
علم الدین ڈرنا موت تھیں نہیں جھنڈے نبی دے نال پیار مینوں

اس کے بعد حضرت عشق لہر کافی دیر تک غازی موصوف سے محو گفتگو رہے اور اس سارے ماجرے کے متعلق جو معلومات حاصل کیں انہیں اس طرح منظوم کیا ہے۔

ستا پیاساں کسے خیال اندر جاگے بھاگ وصال دی رات آئی

طاقت نہیں ہن کراں مونہوں جو جو نظر مینوں کرامات آئی
کسے پاسیوں نور دے چڑھے بدل ہندی رحمتاں دی برسات آئی
ودھ کے کسے بزرگ نے کہیا مینوں تیرے پاس محمدی ذات آئی
علم الدین کھلی اکھ سوچداساں راجپال والی یاد بات آئی.

پیسے خرچن نوں ملے تے چھری لے لئی دل وچ لگی اوہدی گھات میاں
دن ہفتے داد شمن نوں ماریا جد میرے نال سی رب دی ذات میاں
وہلا ہویا حضور دا لئے بدلہ، مینوں ملی پھر میری برات میاں
علم الدین محبت دی ملی دولت دتی جان میں سمجھ زکات میاں

جب بعد میں استاد عشق لہر سے پوچھا گیا کیا علم الدین نے بیان کیا تھا کہ اسے خواب میں کہا گیا ہے کہ راجپال کا قصہ تمام کر دو جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار میں ظاہر کیا گیا ہے تو انہوں نے جواب دیا "شہید مرحوم نے صریح الفاظ میں تو نہیں بتایا مگر ہاں اس کی باتوں سے یہی مفہوم مترشح ہوتا تھا۔"

استاد عشق لہر ملاقات کا احوال یوں بیان فرماتے ہیں جب میں ملاقات کے لئے گیا تو عاشق رسولؐ نے کہا "استاد! میرا دل تمہیں ملنے کو چاہتا تھا الحمد اللہ کہ تم آ گئے" استاد نے جواب دیا کہ تمہاری دلی کشش ہی کا اثر ہے کہ بیٹھے بیٹھے دل میں خیال آیا کہ چلو علم الدین کا دیدار کر آئیں چنانچہ فوراً ٹکرٹ لے کر ریل گاڑی پر سوار ہوا اور تمہارے پاس پہنچ گیا علم الدین نے کہا کہ "میرے حسب حال کوئی شعر کہے ہوں تو سناؤ"، استاد نے جواب دیا "علم الدین اگلے روز تم سے تمہاری والدہ ملنے آئی، ممتا کی ماری کے بے اختیار آنسو نکل آئے تم نے کہا کہ خبردار جس کو مجھ سے رو کر ملنا ہو وہ نہ ملے علم الدین! تم جانتے ہو شاعر کس قدر رقیق القلب ہوتے ہیں اگر شعر سناتے ہوئے میرا دل بے قابو ہو گیا تو کیا مجھ سے بھی ناراض ہو جاؤ گے" وہ شیر دل نوجوان بولا، "استاد دل کو خوب قابو میں رکھ کر سناؤ اگر تم بھی رونے لگے تو میں تم سے بھی منہ پھیر لونگا میں نے جب اس معاملے میں اپنی ماں کا لحاظ نہیں کیا تو تمہارا بھی نہیں کر سکتا استاد میرا دل بالکل مطمئن ہے جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں

اگر تم بھی دیکھ لو تو بخدا کبھی غمگین نہ ہوں گا اس کے بعد ان کے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ اوپر نقل کی جا چکی ہیں۔

○

پریوی کونسل سے اپیل خارج ہونے کے بعد سزا پر عملدرآمد یقینی ہو گیا تھا۔ اس لئے میاں طالع مند نے حکومت سے درخواست گزاری کہ علم الدین کو میانوالی کی بجائے لاہور میں پھانسی دی جائے لیکن گورنمنٹ نے ناعاقبت اندیشی کا دامن تھام رکھا تھا اس لئے یہ استدعا توجہ کے قابل نہ سمجھی گئی اور ۲۳ اکتوبر کو برطانوی حکومت نے درخواست مسترد کر دی جس کے بعد صرف شہادت کے دن کا انتظار تھا۔

۲۷ اکتوبر کو غازی علم الدین سے جب رشتہ دار ملے تو انہوں نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی بھی رو کر مجھے نہ ملے ورنہ اس سے منہ موڑ لیا جائے گا میرا بھائی اب اکیلا رہ جائے گا تم سب اس کو اپنا سمجھنا مجھ کو وفات کے بعد یہاں غسل دینا اور جنازہ بھی یہاں پڑھنا تاکہ میں میانوالی کے مسلمانوں کی دعا سے بھی فائدہ اٹھاؤں پھر مجھے لاہور لے جانا راستے میں جو اسٹیشن آئے اور اس پر گاڑی ٹھہرے باآواز بلند کلمہ شریف کا ذکر کرنا اس سے میری روح خوش ہو گی۔ لاہور لے جا کر مجھے دوبارہ غسل دینا اور اگر ہو سکے تو وہ چارپائی جس پر مولوی تاج الدین کی نعش لے جائی گئی تھی ضرور مہیا کر لینا پھر میرا جنازہ چوبرجی والی گراؤنڈ میں لاہور کے مسلمانوں کی دعائے خیر کے لئے پڑھیں قبر کے متعلق آپ نے فرمایا "میری قبر پختہ نہیں بلکہ کچی تیار کرانا ہاں اس کی حفاظت کے لئے ایک تھڑا بنا دینا اور قبر کے گرد میرے والد کٹہرہ خود اپنے ہاتھ سے تیار کریں اور گلاب کے چار گملے میری قبر کے چاروں کونوں پر ضرور رکھنا قبر کے قریب درخت لگانے کی ضرورت نہیں ہے میری قبر ننگی ہو تاکہ باران رحمت کی بوندیں اس پر آنے سے نہ رکیں صندوق میں رکھ کر پختہ قبر نہ بنانا میں سنت کے طریق پر دفن ہونا چاہتا ہوں میں حضور آقائے دوجہاں ؐ کا کمترین غلام ہوں سوائے اس کے مجھ میں اور کوئی وصف نہیں جب تم میں سے کسی کو مجھ سے ملنے کی خواہش ہو تو درود شریف اور آیت کریمہ پڑھنا اور خدائے کریم سے میرے ملنے کی دعا کر کے سو جانا میں انشاء اللہ ضرور ملوں گا پھر والدہ محترمہ سے مخاطب ہو

کر کہا اماں تو اپنا دودھ بخش دے اور تو خوش ہو کہ مجھے ایسی موت نصیب ہوئی ہے جس کی بڑے بڑے غازی آرزو رکھتے تھے یہ حق دین ہے کہ آگ پینے جائے اور پیغمبری لے کر آئے میرے جیسا حقیر گناہگار اور یہ احسان ربی، میں خوش ہوں اور آپ کے لئے بھی یہ بڑی خوشی کا مقام ہے"۔

۲۸ اکتوبر کو عزیزو اقارب جب ملاقات کے لئے اندر جانے لگے تو غازی علم الدین نے کہلا بھیجا کہ جو میرے سامنے آ کر روئے گا میں اس سے نہیں بولوں گا جب پہلا دستہ کال کوٹھری کے قریب پہنچا تو غازی موصوف کھڑے ہو گئے دوسرے اور تیسرے دستے میں صرف عورتیں تھیں غازی علم الدین نے اپنی والدہ محترمہ سے کہا "اماں خدا کا شکر کریں ایسی موت مر رہا ہوں جو درحقیقت موت نہیں ہے لوگ تو سانپ ڈسنے سے بھی مر جاتے ہیں مگر میری موت تو مثالی ہے رونے دھونے اور نوحہ و شیون کی ضرورت نہیں۔ ہماری انشاء اللہ ہر آٹھویں دن ملاقات ہوا کرے گی" آپ نے فرمایا "میرے جنازے کو لاہور لے جائیں میں نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے کہہ دیا ہے کہ وقت مقررہ پر میرے ہاتھ نہ باندھے جائیں میں خود بہادروں کی طرح جان دینا چاہتا ہوں اور رسے کو بوسہ دے کر پھانسی کے تختے پر چڑھوں گا آپ نے اپنے بھائی سے کہا میرے بعد تم اکیلے نہیں بلکہ سب مسلمان تمہارے حقیقی بھائی ہیں آپ نے فرمایا "مجھے ہندوؤں کے ساتھ کوئی عداوت نہیں جب میں لاہور جیل میں سردار بھگت سنگھ کو ملا تو میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ راجپال مفسدہ پرداز تھا۔ جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فساد برپا کر رکھا تھا۔ لہذا میں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ تاکہ میرا ملک امن سے زندگی بسر کرے کیونکہ جس ملک میں میرے آقا و مولا کے خلاف زہر اگلا جائے اس میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔ آپ نے کہا میں کچھ شعر لکھ رہا ہوں جو آخری ملاقات میں دونگا۔ آپ نے وصیت فرمائی کہ میری قبر کچی ہو اور مجھے خاندانی قبرستان میں دفن کیا جائے آخر میں ارشاد فرمایا میرے دوستوں، منشی طاہر الدین اور ان کے ملنے والوں کو السلام وعلیکم کہہ دینا"۔

۲۹ اکتوبر کو غازی علم الدین شہید کے ایک دوست میانوالی جیل میں شرف ملاقات

کے لیے تشریف لائے آپ نے ان سے فرمایا "بھائی! اس تنگ و تاریک کوٹھری میں بیٹھ کر جو کچھ تمہارے سامنے بیان کروں اسے اہل عالم کے گوش گزار کر دینا تاکہ میرے متعلق اگر کسی کو کوئی غلط فہمی ہو تو دور ہو جائے۔ راجپال کا قاتل میں ہوں اور یقیناً" میں نے ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے والہانہ جذبے سے بے اختیار ہو کر اس فعل کا ارتکاب کیا ہے لوگ کہیں گے کہ میں نے موت کے ڈر سے عدالت میں ارتکاب فعل سے انکار کیا ہے یہ غلط ہے ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ حیات دنیا مستعار ہے اور سب کو ایک دن اس دار فنا سے گزرنا ہے پھر میں کیونکر موت سے ڈر سکتا تھا سیشن عدالت میں میں نے ایک مرتبہ بزرگوں کے مجبور کرنے پر با دل نخواستہ بیان دیا وہ ایک فقرہ جو میں نے جج کے گوش گزار کیا اس سے بھی انکار ثابت نہیں ہوتا دراصل اس فقرے میں رشتہ فرزندی کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے والدین کی منتوں کی بنا پر میں نے منطقیانہ انداز اپنایا تھا۔ میرے نزدیک عشق رسولؐ میں کٹ مرنا وہ بلند ترین مرتبہ ہے جو کسی کسی کو ہی مل سکتا ہے اس لیے موت پر غمگین ہونا تو درکنار، میرے لئے تو یہ خبر کہ پریوی کونسل سے میری اپیل نامنظور ہو گئی ہے انتہائی مسرت کا موجب ہے اور میں خوش ہوں کہ مشیت ایزدی نے اس زمانے میں چالیس کروڑ مسلمانوں میں سے مجھے اس سعادت کے لئے منتخب کیا تمام مسلمانوں کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ وہ میرے جنازے پر آنسو نہ بہائیں اس موقع پر میں اپنی قوم کی آنکھوں میں اشک نہیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

۳۰ اکتوبر کو آخری ملاقات کے لیے غازی علم الدین کے ورثا کو جیل میں بلایا گیا اور انہیں پانچ دستوں میں تشکیل دیا گیا ہر دستہ چودہ افراد پر مشتمل تھا پہلا دستہ غازی موصوف کے والد میاں طالع مند کے ہمراہ دس بجے ملاقات کے لئے حاضر ہوا غازی علم الدین ملاقاتیوں کو مسکرا کر ملے باری باری ان کی خیریت دریافت فرمائی۔ آپ نے والد محترم سے عرض کیا میری قبر اپنے ہاتھوں سے تیار کرنا اور میرے حق میں دعائے خیر فرماتے رہنا" غازی صاحب نے خود روزہ رکھا ہوا تھا مگر مہمانوں کو گھڑے سے اپنے پیالے میں دو دو گھونٹ پانی پلا رہے تھے یہ گھڑا ان کے پاس برآمدے میں پڑا رہتا تھا۔

دوسرے دستے کی قیادت غازی کی والدہ محترمہ کر رہی تھیں اس دستے میں صرف عورتیں تھیں آپ نے والدہ محترمہ سے درخواست کی کہ "وہ افسوس کی بجائے اس بات پر فخر کرے کہ اس نے ایک ایسا مایہ ناز فرزند جنا ہے جس کو شہادت کا اعلیٰ درجہ نصیب ہو رہا ہے یہ صرف اچھی تربیت اور آپ کی نیک دعاؤں کا ثمرہ ہے وگرنہ مجھ ایسے گناہ گار اور غافل انسان کو یہ بلند مقام کیونکر حاصل ہو سکتا تھا۔"

تیسرا دستہ شہید موصوف کے برادر اکبر میاں محمد الدین کے ساتھ آپ کے سامنے پہنچا تو آپ پہلے کی طرح کھڑے ہو گئے سب عزیزوں سے ان کی خیریت پوچھی اور بڑے بھائی سے میٹھی میٹھی باتیں ہوئیں شمع رسالت کے پروانے نے بھائی کو اپنی منگیتر فاطمہ بی بی کے متعلق وصیت فرمائی "کہ اسے ہر ممکن خوش رکھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہنا اور اس کی شادی میں بھائی کی حیثیت سے شامل ہو کر تمام حقوق ادا کرنا۔"

چوتھے دستے میں غازی موصوف کی ہمشیرہ معراج بیگم کے ساتھ صرف عورتیں تھیں آپ انہیں پرتپاک طریقے سے ملے سب کے ساتھ فرداً فرداً مخاطب ہوئے بہن کے ساتھ محبت بھری باتیں کیں اور فرمایا "میری بہن! تو بہت خوش نصیب ہے آج کے بعد تو ہمشیرۂ شہید رسالت کے نام سے پہچانی جائے گی" کسی بہن کے ارمانوں کی دنیا قید حروف میں نہیں آسکتی لہٰذا یہاں خاموشی ہی مناسب ہے وہ حسرت انگیز منظر لکھنے سے نہیں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور دیکھنے کے لئے بھی چشم تصور کی ضرورت ہے چشم تصور بھی وہ جو پاکباز ہو۔ کیونکہ شہید کے حضور میں باریابی کے لئے یہ ضروری ہے بالآخر پانچواں دستہ شرف ملاقات کے لئے جیل میں حاضر خدمت ہوا اس میں حضرت علم الدین غازی کے قریبی دوست اور بعض دور نزدیک کے رشتہ دار شامل تھے آپ نے بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا دوستی کے لہجے میں ان سے گفتگو ہوئی ماضی کی یادیں تازہ کی گئیں اور یوں دو بجے آخری دستے کا وقت ملاقات بھی ختم ہو گیا۔ غازی علم الدین سے ہزاروں لوگ ملاقات کرنے کے خواہشمند تھے آخری دو تین دنوں میں تو عقیدت مند بر تعداد کثیر حاضر ہوئے ان دنوں میں قریبی دوستوں اور سینکڑوں مداحوں نے ملاقاتیں کیں آخری ملاقات میں دیگر اشخاص کے علاوہ

درج ذیل قریبی لواحقین بھی درشن سے فیضیاب ہوئے (۱) میاں طالع مند (۲) میاں محمد دین (۳) والدہ غازی چراغ بی بی (۴) اقبال بی بی اہلیہ محمد دین (۵) غازی موصوف کے چچیرے بھائی حاجی نور دین (۶) معراج بیگم ہمشیرہ غازی (۷) غازی کے تایا میاں نور دین (۸) زینب بی بی (۹) فاطمہ بی بی (۱۰) محترمہ انور سعید صاحبہ بعمر ۶ سال، آخری ملاقات کا حال نہایت پرسوز ہے تمام افراد رو رہے تھے مگر آپ انہیں صبر کی تلقین فرماتے بار بار مسکراہٹ آپ کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگتی غازی موصوف نے روزہ رکھا ہوا تھا لیکن وہ افراد کنبہ کو اپنے گھڑے سے پیالے میں پانی پلاتے رہے غازی کے والد اور دیگر لوگوں کا بیان ہے۔ ایسا فرحت افزا اور جان نواز پانی انہوں نے زندگی بھر نہ پیا پانی کیا تھا۔ آب زم زم تھا جس سے دل کو اتنی طراوت اور آنکھوں کو وہ ٹھنڈک ملی کہ بیان نہیں ہو سکتی اس پانی کی تاثیر کی سب مہمانوں نے بے حد تعریف کی اس پر آپ نے کہا "جس طرح آپ کو یہ پانی پینے سے لذت اور خوشی حاصل ہوئی ہے اسی طرح مجھے بھی تختہ دار پر کھڑے ہو کر واصل باللہ ہونے میں خوشی ہو گی پس میرے جانے کے بعد آہ و بکا اور رونا دھونا کفران نعمت کے مترادف ہو گا چاہیے یہ کہ آپ خدا کا کلام پڑھیں اور اس کا ثواب میری روح کو بخشیں"۔ مجموعی طور پر آپ نے نماز اور صبر کی تلقین فرمائی اور تمام ملاقاتیوں سے مرتبے کے مطابق خطاب کیا۔

غازی علم الدین راہ حق میں جام شہادت نوش کرنے کے بڑے متمنی تھے ۲۳ اکتوبر کے بعد آپ کی بیتاب نگاہیں دروازے پر لگی رہتیں کسی مبارک آہٹ کے انتظار میں وہ ہمہ تن گوش رہتے اور ان کی نرگسی آنکھیں بار بار سوئے بام اٹھ جاتیں اس واقعہ سے بھی آپ کی اضطراب کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک بار التوائے شہادت کے باعث انہوں نے جیلر کا گریبان پکڑ کر کہا "مجھے پھانسی کیوں نہیں دیتے میرے لواحقین پریشان ہو رہے ہیں اور میں جدائی کی اس آگ میں سلگ رہا ہوں میری خواہش ہے جلد از جلد اس مرحلے سے گزر کر دربار رسالت میں شرف باریابی حاصل کروں" ادھر وصال محبوب کے لئے شوق کا یہ عالم تھا مگر رشتے داروں کے گھر سے الفراق الفراق کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں یہاں شہید موصوف کے ماموں سراج دین کا یہ

واقعہ قلمبند کرنا نہایت موزوں رہے گا کہ پریوی کونسل سے اپیل خارج ہونے کے بعد انہوں نے مزنگ میں پھانسی دینے والے جلاد کے گھر کے بالکل قریب ایک مکان کرائے پر لیا اور اس میں رہنے لگے تاکہ جب یہ پھانسی دینے کے لئے باہر نکلے تو مجھے خبر ہو جائے

۳۰ اکتوبر کی شام جب حضرت علم الدین غازی کو بتایا گیا کہ کل علی الصبح پھانسی دی جائے گی تو ان پر نشہ سا طاری ہو گیا، خوشی سے رگوں میں خون کی لہریں گردش کرنے لگیں اور وہ اس فیصلے سے بے حد خوش ہوئے آپ کے چہرے پر بالکل کسی قسم کے تاسف یا پریشانی کے آثار نہ تھے خوشیاں ان کا طواف کر کے وجد میں محو رقصاں تھیں اور ان کا رنگ کندن کی طرح چمک رہا تھا۔

کیا انتظار یار کی حالت بیاں کروں
رہتی ہے جان آنکھوں کے اندر تمام رات

۳۰، ۳۱ اکتوبر کا درمیانی وقفہ ان کے لئے لیلۃ القدر سے کم نہ تھا وہ رات شب برات تھی جو اپنے دامن میں بے پناہ مسرتیں سمیٹ کر لائی، وہ سوز و گداز کے ماحول میں ڈوبی ہوئی غازی علم الدین کی ظاہری زندگی کی آخری رات تھی نواب دین وارڈن جیل (ساکن پھگواڑہ) کا بیان ہے کہ غازی علم الدین کو ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو تختہ دار پر چڑھایا جانا تھا اور میں ان کے کمرے کا نگران تھا۔ جیل کے اندر اور باہر سخت پہرہ تھا۔ شب دیجور میں مضافات کی کوئی شے نظر نہ آتی تھی۔ لیکن اس فداکار کا پر نور چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ غازی علم الدین رات بھر خدائے تعالیٰ کے حضور میں سربسجود رہے اس اثناء میں کئی بار درود و سلام کا ورد کیا اور رات کے پچھلے پہر وہ مترنم آواز میں جھوم جھوم کر دلگداز نعتیہ کلام کے گلدستے دربار رسالت مآب میں پیش کرنے لگے آپ کی مناجات نسیم اور معطر ہواؤں کے دامن میں طیبہ کا سفر طے کرتی رہیں اس دوران لمحہ بہ لمحہ ان کی بے قرار آنکھیں آسمان کی جانب اٹھتیں۔ شاید وہ افق پر کسی ہستی کی متلاشی تھیں۔ اس عرصہ میں ایک لمحے کے لئے مجھ پر غنودگی کا غلبہ ہوا مگر میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں لیکن اب کے غازی علم الدین غائب تھے میں گھبرا گیا اور وسوسے ذہن پر مسلط ہونے لگے میری حیران و پریشان نظریں چار سو کا جائزہ لینے لگیں اور پھر میں نے اسی بدحواسی کے عالم میں کال کوٹھڑی کا

مشاہدہ کیا آہنی سلاخیں جوں کی توں موجود تھیں دروازہ بدستور مقفل تھا اور کسی دیوار میں بھی کوئی شگاف نہ تھا میں پریشانی کے عالم میں دیگر ملازموں کو آوازیں دینے لگا کہ دفعتاً کنج اسارت بقعہ نور بن گیا اب تاریکی کی جگہ نور و نکہت کا ایک سیل رواں تھا میں نے دیکھا غازی علم الدین خشوع و خضوع سے ایک مصلے پر بیٹھے، نظریں اوپر اٹھائے، خاموشی کی زبان میں کسی سے محو گفتگو ہیں اس وقت ایک نورانی بزرگ کا دست شفقت آپ کے سر پر تھا جب میں زیارت کے لئے سلاخوں کے قریب گیا تو وہ مہمان بزرگ غائب ہو گئے اور ناموس رسالت ﷺ کا محافظ جوں کا توں تسبیح و تہلیل میں مستغرق تھا۔"

کروں کیونکر نہ سجدہ سر جھکا کر اپنے سینے کو
کہ سینے میں میرا دل ہے وہ میرے دل میں رہتے ہیں

یہ تجسس کا ایک گرانقدر سرمایہ ہے کہ میانوالی میں آنے والے سفید پوش بزرگ کون تھے اس معاملے میں تشفی کا نسخہ خاموشی کے سوا نہیں اس کا علم آنے والے کو ہے یا جس کے پاس آئے اس نورانی صورت باریش مہمان بزرگ کا کوئی نام رکھنا سوء ادب ہے وہ منزل تھی جو اپنے مسافر کے قریب آئی یا کنواں تھا پیاسے کے پاس آ گیا باد صبح گاہی نے محب کا پیغام سنایا اور محبوب آیا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں سر پہ دست شفقت پھیرا، ملنے والا آیا، ملا، اور مل کر چلا گیا عقل کی کیا مجال جو سوچ سکے کہ تشریف لانے والے کون تھے بس عشق ہے جو یک جست میں ان منزلوں کو طے کر جاتا ہے۔

"عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی"

۳۰ اکتوبر کو یہ خبر کہ کل غازی علم الدین کو شہید کر دیا جائے گا آناً فاناً سارے شہر اور مضافات میں پھیل گئی چنانچہ بدھ کی رات کو نو بجے کے قریب موسیٰ خیل، عیسیٰ خیل، داؤد خیل سے اور مقامی مسلمان جوق در جوق آنا شروع ہو گئے جیل سے شہر تک دو میل کے فاصلے میں انسانوں کا ایک سمندر لہریں مارتا نظر آتا تھا وہ لوگ اپنے ساتھ ڈھول لائے تھے اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں میں اس زور سے ڈھول بجاتے کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی وہ لوگ۔ تپتے میدان میں رات بھر درود شریف کا ورد کرتے رہے ان کی یہ بڑی تمنا تھی کہ وہ صبح اول ہی اول شہید کا چہرہ مبارک دیکھیں

گے۔ آدھی رات کے وقت لاہور سے تاج دین بٹ، میاں نیاز احمد، نیاز محمد کمبوہ، ملک منظور الٰہی اور دیگر اہم افراد بھی میانوالی پہنچ گئے جنہوں نے غازی علم الدین کے نعروں کا جواب دینے کا پورا پورا انتظام کر دیا۔

⭘

۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء مطابق ۲۶ جمادی الاول ۱۳۴۸ھ جمعرات کی صبح صادق بلبل حریت محافظ دین و ملت، پروانہ شمع رسالت کے لیے وصال کی خوشیوں کا پیغام لے کر آئی، ڈپٹی کمشنر پھانسی گھر میں پہنچ چکا تھا داروغہ جیل، سول سرجن اور دوسرے متعلق حکام بھی موقع پر موجود تھے غازی علم الدین نماز پڑھنے کے بعد قبلہ رو ہو کر درود و ظائف میں معروف تھے کہ ساڑھے چھ بجے ڈاکٹر اور داروغہ جیل نے آ کر یہ خوشخبری سنائی، اے غازی! جس کا آپ کو انتظار تھا وہ مبارک ساعت آن پہنچی ہے آپ نے کہا بسم اللہ میں حاضر ہوں، چلیئے! جیل کے قواعد کے مطابق آپ کو سیاہ لباس پہنا دیا گیا اس وقت ان کے چہرے پر بشاشت طمانیت اور تسکین خاطر کا نور چمک رہا تھا مجسٹریٹ نے پوچھا "آپ کی کوئی آخری خواہش" اس پر غازی علم الدین مسکرائے اور فرمایا "صرف دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرنے کی اجازت" چنانچہ آپ نے دو رکعت نفل پڑھے اور منزل شوق کی طرف جادہ پیما ہوئے۔

بھولے نہ مرتے مرتے آداب کوئے جاناں
جب سر نے ساتھ چھوڑا سجدے کئے نظر سے

غور طلب پہلو یہ ہے ایک شخص سوئے دار چلا جا رہا ہے ہونٹوں پر تبسم کی کرنیں رقصاں ہیں۔ خوش چال ہرن اس کی گام زنی کی ادائیں چراتا ہے قلبی طمانیت پر باد صبا قربان ہوا چاہتی ہے استقامت دامن پھیلائے بیٹھی ہے۔ چہرے پر ایسی شگفتگی کہ پھول رشک کے نشہ میں چور چور، مستقل مزاجی کے سامنے پہاڑوں کے دل پگھل رہے ہیں شادی مرگ کے ولولے محو طواف ہیں اور کائنات کی رعنائیاں ان کے پاؤں تلے بچھی بچھی جاتی ہیں۔

ایمان پرور نظارہ دید کے قابل تھا اسلام کا فرزند موت کا جشن مناتا ہے اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی ہے فرش خاک کا ذرہ ذرہ مرحبا غازی! مرحبا یا غازی! پکار رہا ہے موت کا نام

سن کر تو بڑے بڑے بہادر کانپ جاتے ہیں ان کے چہرے پژمردہ، حواس مختل، آنکھیں مبہوت اور زبانیں گنگ ہو جایا کرتی ہیں۔ مگر اس خدائی میں جانے وہ کون سی بات تھی اللہ اکبر کا نعرہ لگاتا، تو جیل سے باہر عظیم مجمع کے ایک ایک فرد کو سنائی دیتا بصد شوق و ناز موت کے منہ میں پہنچتا ہے تو قتل گاہ جھک کر خوش آمدید کہتی ہے آخر وہ وقت بھی آگیا جب واصل بحق ہوتے میں صرف ایک گھڑی باقی تھی۔ تختہ دار پر کھڑے ہو کر آپ نے فرمایا "حاضرین! بلاشبہ شاتم رسولؐ کا قاتل میں ہوں۔ میں نے اسے جذبہ عشق سے سرشار ہو کر قتل کیا اب سب میرے کلمے کے گواہ رہو۔ چنانچہ آپ نے با آواز بلند کلمہ شہادت پڑھا۔ دار و رسن کو چوما اور درود و سلام کا ورد کرتے ہوئے پھندے کو گلے میں ڈال لیا اس پر مجسٹریٹ نے کہا "اے غازی! یہ تو خودکشی کے مترادف ہے جو جرم ہے اور گناہ بھی"۔ آپ نے یہ فرماتے ہوئے کہ "تمہارا علم کا مذہب اور میرا عشق"، پھندا گردن سے نکال دیا۔ آپ نے رسی کو بوسہ اس لئے دیا کہ وہ ہر اس شے کو متبرک و مقدس سمجھ کر اس کی عزت و تعظیم کیا کرتے جو ان کو بارگاہ رسالت میں پہنچانے کا ذریعہ ہو

اپنے کوچہ میں میرا جذبہ تحریم تو دیکھ
اک اک ذرہ کو آنکھوں سے اٹھا لیتا ہوں

جام شہادت نوش کرتے وقت آپکے چہرے سے مسرت ٹپکتی تھی وہ بڑے جوش سے اللہ اکبر کے نعرے لگاتے۔ تمام دوسرے قیدی آپ کے جواب میں اس قدر زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے کہ باہر تک آوازیں سنائی دیتیں۔ باہر سے بھی غازی علم الدین کے ارشاد کے مطابق متواتر اللہ اکبر کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جیل کے قواعد کیمطابق آپ کے ہاتھ اور پاؤں رسی سے باندھ دیئے گئے سیاہ ٹوپی پہننے سے پہلے آپ جیل کے مسلمان ارکان کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور یہ شعر پڑھا۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور سات بجے جلاد نے تختہ کھینچ دیا اتنے میں ساقی کوثر اپنے میخوار کے لئے مقتل میں تشریف لے آئے آپ کے ساتھ سینکڑوں فرشتے بھی روح

کے استقبال کے لئے موجود تھے اور غازی علم الدین کی بے قرار روح آشیانہ خاکی سے اڑ کر اپنے آقا و مولاؐ کے قدیم میمنت لزوم سے لپٹ گئی۔

"اسے موت کہتے ہیں یارب تو بار بار آئے"

غازی علم الدین شہید کو آٹھ بجے تختہ دار سے اتارا گیا جیل کے باہر پرامن ہجوم شہید کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھا ان کی نگاہیں جیل کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں دس بجے شہید ناز کی لاش کو ایک چارپائی پر ڈال کر باہر لایا گیا۔ گروہ کے گروہ اس میدان کی طرف بڑھے جہاں سرور کونینؐ کے جانباز کی لاش پڑی ہوئی تھی ڈی ایس پی جس کا نام غالباً" بی ٹی تھا" نے حکم دیا کہ چارپائی کو اٹھا کر لے چلو۔ لوگ بھی کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے جنازے کے پیچھے ہو لئے جب شہید کے جنازے کو لاوارثوں کے قبرستان میں لے جا کر رکھ دیا گیا تو اس وقت تمام ہجوم قبرستان سے متصل سڑک پر اپنے عاشق رسولؐ کے چہرہ انور کو دیکھنے کے لئے کھڑا ہو گیا حکام نے جب دیکھا کہ لوگ گھروں کو نہیں جاتے۔ تو سنیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے سپاہیوں کو پرامن ہجوم پر سنگ باری کا حکم دیا جس پر لوگ پتھر کھاتے رہے ادھر ڈپٹی کمشنر نے فرزند توحید کو بغیر کفن کے گڑھے میں ڈال دیا اور نماز جنازہ کی اجازت تک نہ دی اس دوران بعض جوشیلے مسلمانوں نے بھی پولیس پر پتھر پھینکے جس سے ڈی ایس پی شدید زخمی ہو گیا جب آپ کو دفن کیا جا رہا تھا تو ایک مسلمان نمبردار قیدی نے اپنا کمبل درود و سلام پڑھ کر آپ کے پاک جسم پر ڈال دیا اور شہید کو ایسی قبر میں ڈال دیا گیا جو ان کے لئے کافی نہ تھی اس شخص کو جس کے وارث کروڑوں مسلمان تھے جابر اور ظالم برطانوی حکومت نے لاوارثوں کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔

حصولِ میّت کی جدوجہد

- کفن بدوش مجاہد میدانِ عمل میں
- حضرت علامہ اقبال مرحوم کی تڑپ
- اور حکامِ امن کی بھیک مانگتے ہیں

ہو اثر اتنا تو سوزِ نالہ و فریاد کا
ہم تماشا دیکھ لیں گھر پھونک کر صیاد کا

"اگر کوئی ایسی بات ہو گئی تو میری گردن اڑا دینا" اس کے بعد آپ کے چہرے سے جلال برسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد آپ کی آنکھیں پرنم ہو گئیں اور فرمایا "ہم عاشق رسولؐ کی محبت میں اپنے مطالبے سے کسی صورت بھی دستبردار نہیں ہو سکتے"

شہید علم الدین غازی کے ورثاء نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ پھانسی میانوالی کی بجائے لاہور میں دی جائے لیکن حکومت نے اس درخواست کو قابل اعتنا نہ سمجھا۔ ۳۰ اکتوبر کو میاں طالع مند نے انار کلی کے منشی طاہر الدین کے نام ایک تار بھیجا جس کا مضمون یہ تھا "جیل کے حکام سے کوئی اطلاع نہ ملنے پر ہم ڈی سی کے پاس گئے۔ جس نے بتایا کہ علم الدین کو کل صبح پھانسی دی جائے گی لیکن میت لاہور لے جانے کی اجازت نہیں ہے" درج بالا خبر کہ کل صبح غازی علم الدین کو جام شہادت پلا دیا جائے گا اور ورثا کو ان کی میت لاہور لانے کی اجازت نہیں۔ پورے لاہور میں برق رفتاری سے پھیل گئی اور مضطرب لوگ جوق در جوق شہر میں گشت کرنے لگے اور گروہ کے گروہ صورت حال معلوم کرنے کے لئے اخباروں کے دفتر میں پہنچے، ہر طرف اللہ اکبر اور غازی علم الدین زندہ باد کے نعرے سنائی دینے لگے مسلمان اس خبر سے خاصے مشتعل تھے کہ میت کو لاہور لانے سے روکنے کے بہانے تراشے جانا، مسلمان قوم کی سخت توہین ہے۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور مسلمانوں میں جابر حکومت کے خلاف ایک زبردست ہیجان و اضطراب پیدا ہو گیا۔ دوسرے دن مسلمانوں نے عام ہڑتال کی روزے رکھے اور جگہ جگہ ننگے سر جلوس نکالے ۳۱ اکتوبر کو صبح دس بجے دن ایک بہت بڑا جلسہ دہلی دروازہ کے باغ میں چوہدری محمد گھسیٹا کی زیر صدارت منعقد ہوا تلاوت و نعت کے بعد ابو الفخر، مولانا سید امام علی شاہ نازش رضوی مدیر و معاون سیاست نے ایک نظم پڑھی۔ پھر مولانا سید حبیب شاہ صاحب کھڑے ہوئے آپ نے فرمایا "کل عصر کے وقت لاہور میں میانوالی سے کئی تار موصول ہوئے جن سے معلوم ہوا کہ آج صبح صادق کے وقت غازی علم الدین کو شہید کر دیا جائے گا یہ خبر بجلی کے ذریعے سے آئی اور بجلی ہی کی تیزی سے تمام شہر میں پھیل گئی۔ صدہا مسلمان رات کے دس بجے تک دفتر سیاست میں آئے اس لئے کہ اس خبر کے ساتھ یہ اطلاع بھی درج تھی کہ حکومت نے شہید کی لاش کو لاہور لانے کی اجازت نہیں دی۔ میاں علم الدین نے جو کام کیا ہے وہ بے نظیر ہے آپ نے صفحہ دہر پر انمٹ الفاظ میں اپنے خون سے یہ حقیقت منقش کر دی ہے۔

مسلمان لاکھ برے ہوں مگر نام محمدؐ پر
وہ ہیں تیار ہر حالت میں اپنا سر کٹانے کو

میاں صاحب شہید ہیں اور ہم ان کا لاشہ حکومت سے طلب کرتے ہیں اس لئے کہ ہر بت پرست، ہر خدا پرست، ہر عیسائی اور موسائی غرض ہر مذہب کے لوگ مرنے والے کی وصیت کو پورا کرنا فرض سمجھتے ہیں اور شہید مرحوم نے وصیت کی ہے کہ ان کو لاہور میں دفن کیا جائے اس فرض کو پورا کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے شہید مرحوم اب اپنے والدیا رشتہ داروں کا مال نہیں رہے وہ خدا اور اس کے رسول پاکؐ کا مال ہیں وہ ہم مسلمانوں کا ورثہ ہیں ان کی عزت ہماری عزت ہے اور خدا اور رسولؐ کی عزت ہے نیز مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے مرنے والے بھی ان کے لئے دعائیں کرتے ہیں ان کا فیض مرنے سے ختم نہیں ہوتا اور شہید تو زندہ و جاوید ہیں ہر شہید گناہ سے پاک ہوتا ہے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ نماز جنازہ مرحوم اور زندوں دونوں کے لئے مفید ہوتی ہے مرحوم نیک ہو تو نماز ادا کرنے والے بخشے جاتے ہیں اور اگر نمازیوں میں ایک بھی مرد مقدس موجود ہو تو مرنے والے اور نمازیوں کے سب گناہ بخش دیئے جاتے ہیں" اس تقریر کے بعد سید حبیب شاہ صاحب اور ملک فتح شیر خان گورنر کو تار دینے چلے گئے ان کے چلے جانے پر مولوی مظہر علی اظہر، علامہ تاج الدین احمد تاج، جناب ظہور اور شوخ صاحب نے نظم و نثر میں اظہار خیال کیا اور جلسہ منتشر ہو گیا۔ اس روز ننگے سر درجنوں چھوٹے چھوٹے جلوس نکالے گئے جو مختلف اہم راستوں سے گزر کر بھاٹی دروازہ پہنچے اور وہاں سے موچی دروازہ میں آئے اسلامی جمعیت کا ایک بے پایاں سمندر تھا جو لاہور کے بازاروں میں امڈا چلا آ رہا تھا پر جوش، ہجوم نہایت مشتعل تھا اور گورنمنٹ ہاؤس تک جانا چاہتا تھا مگر سنجیدہ اصحاب نے اس پر قابو پائے رکھا بعدہ، منتشر گروہ ایک عظیم جلوس کی صورت اختیار کر کے رات نو بجے بیرون موچی دروازہ باغ میں آ کر جلسے کی صورت میں جمع ہو گئے مجمع پچیس تیس ہزار کے لگ بھگ تھا میاں محمد بخش مسلم صاحب صدر جلسہ قرار پائے۔ ڈاکٹر سلطان احمد سیکرٹری مجلس خلافت پنجاب اور دیگر اشخاص نے اس امر کی قرارداد میں منظور کیں کہ حکومت کو چاہیے علم الدین کی نعش بلا شرط مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ تاکہ وصیت کے مطابق تجہیز و تکفین لاہور میں کی جا سکے شیخ غلام مصطفےٰ حیرت معتمد انجمن احرار الاسلام

نے مذکورہ قرار داد کی پرزور الفاظ میں تائید کی اور کہا "کتنے افسوس کی بات ہے حکومت نے راجپال کی لاش تو ہندوؤں کے حوالے کر دی مگر مسلمانوں کے لئے یہ بہانہ بنایا جا رہا ہے کہ لاش کے لاہور پہنچنے پر ہندو مسلم فساد کا خدشہ ہے" مولانا محمد بخش مسلم نے اس قرار داد کی حمایت کرتے ہوئے اپنی تقریر میں حکومت پر واضح کیا "اگر مسلمان مطالبہ نہ کرتے تو اور بات تھی اب جب کہ انہوں نے مطالبہ شروع کر دیا ہے یہ کبھی بھی اپنے مطالبے سے دستبردار نہیں ہوں گے اس لئے مناسب یہی ہے کہ حکومت میت کو جلد از جلد بلا حیل و حجت مسلمانوں کے حوالے کر دے تاکہ تصادم کی نوبت پیش نہ آئے" انہوں نے مسلمانوں پر بھی زور دیا کہ وہ اتحاد اور تدبر سے کام لیں اور حتی المقدور محاذ آرائی سے گریز کریں اس موقع پر مولانا محمد بخش مسلم صاحب نے حکومت کو یقین دلایا کہ مسلمان ایک مہذب قوم ہے یہ جو وعدہ کرتی ہے اسے ایفاء کرنے کی کوشش کرتی ہے اگر لاش مسلمانوں کے سپرد کر دی جائے تو یقیناً" ہم ایسے موقع پر فساد نہیں کریں گے اس کے بعد یہ قرار داد بذریعہ تار حکومت تک پہنچانے کا فیصلہ کیا گیا جس کے لئے سٹیج کے قریب بیٹھے ہوئے حاضرین نے ایک پیسہ فی کس کے حساب سے چندہ دیا جس کا تخمینہ بائیس روپے چودہ آنے ہوا جلسے کے اختتام پر غازی علم الدین زندہ باد اور غازی عبدالرشید زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔ اس قرار داد کے علاوہ لاہور کی مختلف مقتدر اسلامی انجمنوں اور ذی اثر معززین شہر نے گورنر پنجاب، چیف سیکرٹری، حکومت پنجاب، ڈپٹی کمشنر اور دیگر اعلیٰ حکام کو بر صیغہ حصول نعش برقی پیغامات ارسال کئے۔

لاہور میں ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا ادھر خان محمد اکبر خان رئیس اعظم میانوالی کی مساعی جمیلہ بھی قابل ذکر ہے۔ ۳۱ اکتوبر کی شام کو ایک وفد آپ کے زیر سرکردگی ڈپٹی کمشنر میانوالی راجہ زمان مہدی خاں سے ملا اور اس سے کہا "ہمیں حکام جیل سے معلوم ہوا ہے کہ میاں علم الدین کی لاش کو لاہور لے جانے کی اجازت نہیں ہو گی" ڈپٹی کمشنر نے جواب دیا۔ "شہید کا جنازہ جیل کے سامنے رکھ دیا جائے گا آپ ورثا کو لے کر پہلے ہی وہاں پہنچ جائیں صفوں کو درست کر رکھیں وہاں نماز جنازہ ادا کریں اور پھر ان کو جیل کے قریب لاوارثوں والے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا جائے گا۔" اس پر خان محمد اکبر خان صاحب نے ہر ممکن یقین دلایا

کہ میں ہر بات کا ذمہ لیتا ہوں غازی کی نعش کو ان کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ لاش کو وصیت کے مطابق لاہور لے جائیں لیکن ان کی ہر ایک آرزو ٹھکرا دی گئی آخر میں خان صاحب نے کہا کہ "اچھا شہید کو شہر کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت دی جائے" لیکن اس بات کی بھی پروانہ کی گئی اور وفد ناکام و نامراد لوٹ آیا اس سلسلے میں میانوالی، موسیٰ خیل، عیسیٰ خیل اور قرب وجوار کے باشندوں کی جرأت بھی قابل داد ہے جب انتظامیہ نے میت کو ورثاء کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور شہید کی لاش کو لاوارثوں کے قبرستان میں لے جایا جا رہا تھا۔ مقامی باشندے اس وقت سخت اشتعال میں تھے۔ انہوں نے میاں طالع مند اور لاہور کے دیگر معززین سے کہا اگر اجازت دی جائے تو ہم صرف پندرہ منٹ کے اندر لاش انتظامیہ سے چھین دیتے ہیں۔ یکم نومبر کو صبح میاں طالع مند کا ایک تار انقلاب میں پہنچا جس کا مضمون یہ تھا "شہید مرحوم کی میت کو بطور امانت چھوڑ کر آ رہا ہوں انہیں بری طرح دفن کیا گیا ہے نماز جنازہ کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ حکام کو لاش چھن جانے کا اندیشہ تھا اس لئے جلدی سے آپ کو دفن کر کے گڑھا پر کر دیا گیا۔ مرحوم اور مٹی کے درمیان صرف ایک کمبل کا پردہ ہے" اسی روز بعد از دوپہر غازی علم الدین شہید کے والد میانوالی سے لاہور تشریف لائے۔ مسلمانوں کے جم غفیر نے سٹیشن پہ آپ کا استقبال کیا اور بڑے جوش و خروش سے غازی علم الدین شہید زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔ ۲ نومبر کو بھی لاہور میں کئی چھوٹے چھوٹے جلوس نکالے گئے حکام کو اس سلسلے میں کئی تار ارسال کئے گئے مسجدوں میں دعائیں مانگی گئیں اور سینکڑوں جگہ غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔

۳ نومبر کو مسلمانان لاہور کا ایک جلوس شہید کے مکان پر پہنچا آپ کے بھائی، والدہ باپ اور چچا کے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور ہدیہ مبارک باد پیش کیا گیا۔ اس موقع پر علم الدین شہید کی والدہ نے فرمایا "اگر میرے سات لڑکے ہوتے اور وہ اسی طرح تحفظ ناموس رسالت ﷺ کے لئے قربان ہو جاتے تو میں زیادہ خوش ہوتی"، جلوس شہید کے لواحقین کو خراج تحسین پیش کرتے کے بعد بیرون باغ دہلی دروازہ میں پہنچا۔ جوشیلے طرزین

نے شہید کی تصویریں اٹھا رکھی تھیں وہ اللہ اکبر اور غازی علم الدین شہید زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ باغ میں وہ عظیم الشان جلسے کی صورت میں مرتب ہو گیا منشی غلام مصطفےٰ حیرت مدیر "فردوس" بالاتفاق رائے صدر جلسہ قرار پائے۔ انہوں نے افتتاحی تقریر میں کہا "میں نے اپنے خدا سے عہد کیا ہے کہ یا تو اپنے بھائی غازی علم الدین کی لاش کو لاہور لاؤں گا یا اپنی قبر بھی وہیں بنواؤں گا جہاں اس شہید کی نعش دفن کی گئی ہے" پھر بشیر احمد رفیقی کے ساتھ تمام وہ رضاکار کھڑے ہو گئے۔ جنہوں نے حلف اٹھا رکھے تھے کہ ہم لاش لائیں گے قابل ذکر بات یہ ہے کہ کھڑے ہونے والوں میں حکیم احمد حسن، ملک لال دین قیصر اور مولانا ظفر علی خان بھی شامل تھے رضاکاروں نے یک زبان ہو کر باآواز بلند بار بار اس شعر کو پڑھا۔

غازی کی نعش لینے ہم گھر سے جا رہے ہیں
ناموس مصطفےٰ پر جانیں لڑا رہے ہیں

اس روز بعد از دوپہر سر میاں محمد شفیع کی کوٹھی پر مسلم لیگ کا ایک اہم جلسہ منعقد ہوا۔ غازی علم الدین شہیدؒ کے لاشہ کی واپسی پر غور وخوض کیا گیا۔ مولانا غلام محی الدین خان صاحب قصوری نے پرزور الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا کہ میاں علم الدین علیہ الرحمتہ کے لاشہ کی عدم حوالگی پر مسلمانوں کے مابین بڑا ہیجان پایا جاتا ہے ہمیں ان کی پوری نمائندگی کرنا چاہیئے۔ میں اس کی یقین دہانی کرانے کو تیار ہوں کہ کسی قسم کے فساد کا خطرہ نہیں اس پر لیگی رہنماؤں نے اس مضمون کا ایک ریزولیوشن منظور کیا "حکومت پنجاب غازی علم الدین کی نعش کو اس کے ورثا کے حوالے کر دے تاکہ اسے لاہور میں اس کی وصیت کے مطابق دفن کیا جائے اور اگر حکومت کو کسی قسم کے فساد کا خطرہ ہو تو وہ حفظ امن کے طور پر جو عملی تدابیر اختیار کرے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں" مجلس خلافت نے بھی اپنے خاص اجلاس میں اسی قسم کی قرارداد منظور کی۔ اس کے بعد حصول نعش کی خاطر مزید صلاح ومشورے کے لئے مسلم معززین کا میاں عبدالعزیز بیرسٹر کے مکان پر اجتماع ہوا جس میں مولانا سید حبیب شاہ ڈاکٹر سلطان احمد، شیخ حسن دین وکیل، ملک لال دین قیصر وغیرہ ہم شامل تھے۔ وہاں پر قرارداد پیش ہوئی کہ گورنر کے پاس ایک وفد بھیجا جائے جو گفت وشنید کے ذریعے اپنے مطالبات تسلیم کروائے، بنابریں شیخ حسن دین ایڈووکیٹ اور میاں عبدالعزیز صاحب کی تحریک سے اکابرین لاہور

کا ایک جلسہ برکت علی محمڈن ہال (برکت علی اسلامیہ ہال) میں بلایا گیا جس میں مسلم اخباروں کے ایڈیٹر، اسلامی انجمنوں کی مجلس عاملہ کے ارکان، بعض میونسپل کمشنر اور دیگر با اثر معززین بھی موجود تھے علامہ اقبال صدر جلسہ قرار پائے گورنر سر جیفری ڈی مونٹ مورلنسی متوقع خطرات کے پیش نظر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود اس کے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہے اس لئے جلسے کی قرارداد کے مطابق علامہ اقبال نے مسٹر سٹوور بر مابیات سے ٹیلیفون پر وقت مقرر کر کے ان سے ملاقات کی۔ اس موقع پر چیف سیکرٹری مسٹر ایمرسن بھی موجود تھا یہ ملاقات قریباً ایک گھنٹہ جاری رہی جس میں ڈاکٹر اقبال نے مسلمانان پنجاب کے جذبات و احساسات کا نقشہ کھینچا اور قیام امن کی ذمہ داری خود اٹھائی لیکن حکومت پنجاب بضد تھی کہ شہید کی میت کو میانوالی جیل میں دفن کیا جا چکا ہے اور اب اس میں کسی رد و بدل کی گنجائش نہیں ۔

⊙

حصول نعش کی خاطر مسلمانوں کی طرف سے جلسے جلوسوں کا ایک سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔ ۵ نومبر کو ایک زبردست جلوس امیر بخش پہلوان کی قیادت میں نکلا۔ طلبائے کالج اور رضاکاروں نے اپنے اپنے بستر کندھوں پر اٹھا رکھے تھے۔ جب جلوس بھاٹی دروازہ پہنچا تو ایک عظیم الشان جلسہ شروع ہوا۔ یہاں مولانا ظفر علی خاں نے ایک زوردار تقریر کی۔ آپ نے خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا "اسلام کے سپاہیو! اور لاہور کے مسلمانو! ہم نے دیکھ لیا ہے کہ رسول اکرم کی غیرت پر مرمٹنے کا کیا نتیجہ ہے نتیجہ یہ ہے کہ مردہ قومیں زندہ ہو جائیں۔ آج ہماری قوم از سر تا پا غیرت و حمیت کا نمونہ ہے یہ وہ طاقت ہے جس کے مقابلے میں کوئی طاقت نہیں ٹھہر سکتی۔ رضاکاروں کو دیکھو کہ ہر ایک نوجوان صبر کی بولتی چالتی تصویر ہے ان کے جسموں پر لاٹھیاں پڑیں، انہیں ریزہ ریزہ کر دیا جائے مگر یہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہٹیں گے"

غلام مصطفےٰ احیرت کے بھائی الطاف حسین نے کہا "اگر عورتوں کا کوئی دستہ سول نافرمانی کے لئے تیار ہو تو میری والدہ سب سے پہلے اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار ہے"

اسی روز ایک لڑکا محمد حسین نامی پیش کیا گیا۔ جس کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال تھی وہ چند معززنہ

اشخاص کی سفارشی چٹھیاں بھی لایا تھا۔ کہ اسے سول نافرمانی کرنے والے پہلے جتھے میں شامل کیا جائے۔ وہ گھر سے میانوالی کا کرایہ دو روپے اور اپنا بستر بھی ساتھ لایا۔ باپ نے اسے بہت روکا اور زدوکوب بھی کیا۔ مگر اس کا جذبہ جہاد سرد نہ پڑا اور وہ بھاگ کر یہاں پہنچ گیا۔ احتجاجی سلسلے میں سریانوالہ بازار کے ڈاکٹر نثار علی حیرت نے بھی "علم الدین کمیٹی" سے درخواست گزاری کہ مجھے رضاکار بھرتی کیا جائے۔ مگر ضعیف العمری کے سبب انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی دوران میں میاں عبدالعزیز مارواڑہ نے گورنر وقت اور دیگر کارکنان بست و کشاد کو انتباہ کیا۔ کہ اگر لاش مسلمانوں کے حوالے نہ کی گئی تو تمام نتائج کی ذمہ داری خود حکومت پر عائد ہوگی۔

اب احتجاج کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے مطالبے میں روز بروز شدت آرہی تھی۔ بڑی بڑی شاہراہوں اور ہر کوچے کے در و دیوار پر جلی حروف میں لکھا ہوا نظر آتا "غازی علم الدین شہید کی میت ملت اسلامیہ کے حوالے سے کرو! اور ہم شہید کی نعش لے کر رہیں گے"، کمیٹی کی طرف سے جو جلوس نکالے جاتے تھے ان میں یہ نعرے لگائے گئے "اگر نعش واپس نہ ملی تو پنجاب کا جو حشر ہوگا وہ تاریخ کا ایک انوکھا باب ہوگا"،

اس حادثے سے پورے پنجاب بلکہ برصغیر کی فضائے بسیط پر غم و غصے کی فضا چھائی ہوئی تھی، پروانۂ چراغ مصطفوی، محب محبوب رب العالمین کی شہادت اور کسمپرسی کی حالت میں تجہیز و تکفین کی جانگداز خبر جہاں بھی پہنچی۔ یہ روح فرسا اطلاع پا کر فرزندان توحید پر از حد رنج و الم طاری ہوا۔ غائبانہ جنازے پڑھے گئے۔ ایمان افروز تقریریں ہوئیں اور لوگ کاندھوں پر کفن باندھ کر میانوالی جانے لگے۔ ۵ نومبر کو ایک عظیم الشان احتجاجی جلسہ منعقد ہوا جس کا تذکرہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس کے اختتام پر مسلمان معززین کا ایک وفد ساڑھے چار بجے گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر پنجاب سر جیافری ڈی مونٹ مورنسی سے ملا ارکان وفد میں سترہ میونسپل کمشنر، ڈاکٹر اقبال، سر میاں محمد شفیع، چودھری دین محمد، مولوی محمد علی، سید مراتب علی شاہ اور میاں عبدالعزیز بیرسٹر کے علاوہ دیگر حضرات بھی شامل تھے۔ گورنر کی ہدایت پر ایک اور وفد ۶ نومبر کو اڑھائی بجے کے قریب دوبارہ گورنر پنجاب سے ملا اس روز مذکورہ ارکان کے علاوہ مولانا

ظفر علی خان، سر فضل حسین، خلیفہ شجاع الدین، میاں امیر الدین، مولوی غلام محی الدین قصوری اور مولانا سید حبیب شاہ وفد میں سر فہرست تھے گورنر کو طرفین یعنی ہندو اور مسلمان قوم کے جذبات و احساسات کا سی آئی ڈی اور دیگر مخصوص ذرائع کی وساطت سے تجربی علم تھا۔ اس لئے اس نے سب سے پہلا سوال یہ کیا۔ اگر نعش کے آنے پر لاہور میں فساد ہو گیا تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا اس پر ڈاکٹر اقبال جھٹ بول اٹھے! "یور ایکسیلنسی! اگر کوئی ایسی بات ہو گئی تو میری گردن اڑا دینا" اس کے بعد آپ کے چہرے سے جلال برسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد آپ کی آنکھیں پرنم ہو گئیں اور فرمایا "ہم عاشق رسول کی محبت میں اپنے مطالبے سے کسی صورت بھی دستبردار نہیں ہو سکتے" جوش جذبات کی یہ کیفیت دیکھ کر گورنر کو کہنا پڑا۔ اچھا آپ کو نعش تو مل سکے گی مگر اس کے لئے یہ شرائط ہیں (الف) جنازہ شہر کے اندر سے نہ گزرے (ب) مسلمان اپنے جذبات و احساسات کو قید ضبط میں رکھیں اور اشتعال انگیز نعرے نہ لگائے جائیں (ج) قیام امن و امان کے لئے اخبارات ہیجان انگیز اداریے اور اشتعال انگیز خبروں کی اشاعت بند کر دیں (د) مسلمان جلوس نکالنے اور احتجاجی جلسے منعقد کرنا چھوڑ دیں۔

ساحل پہ لوگ یوں ہی کھڑے دیکھتے رہے
دریا میں ہم جو اترے تو دریا اتر گیا،

۷ نومبر کی شام گورنر نے میت کی واپسی کی باقاعدہ اجازت دے دی اور ۸ نومبر کو مسٹر ایچ ڈبلیو امیرسن چیف سیکرٹری حکومت نے درج ذیل سرکاری اعلان شائع کرایا۔ میاں علم الدین کو لاہور میں دفن کرنے کے لئے مسلمانوں کا جو وفد حکومت پنجاب کی خدمت میں پیش ہوا اس کے متعلق حکومت نے جو فیصلہ کیا ہے وہ عوام کی اطلاع کے لئے شائع کیا جاتا ہے ابتداء سے ہی حکومت پنجاب کی یہ خواہش رہی ہے کہ فرقہ وارانہ امن کی بحالی کے لئے جملہ ذرائع و اختیارات کو بروئے کار لا کر مذہبی منافرت کو ہوا نہ دینے کے انتظامات کئے جائیں اور اسی مقصد کے حصول کے لئے ۱۳ اکتوبر کو میانوالی میں دفن کرنے کے انتظامات کئے گئے گزشتہ چند روز کے دوران میں مسلمان رہنماؤں کے مشورے سے اس سلسلے میں غور کیا گیا تاکہ معلوم کیا جائے کہ آیا ایسے انتظامات کرنا ممکن ہیں جن سے مسلمانوں کی آرزوئیں پوری ہو جائیں اور ساتھ ہی

امن عامہ میں کسی قسم کا خطرہ پیدا نہ ہو''

جس قوم کی آنکھ میں بجلیاں پوشیدہ ہوں اس کے اشارہ ابرو سے تاریخ مرتب ہوتی ہے اور وقت کا دھارا ہمہ وقت اس کے حضور میں دست بستہ حاضر رہا کرتا ہے جن کے دامن میں چنگاریاں پنہاں ہوتی ہیں شاہی تخت کی تعمیر و تخریب ان کے ابھار پر ہوتی ہے فاتح و حاکم یوں ہی مطالبے نہیں مان جاتے بلکہ ان سے بزور طاقت منوائے جاتے ہیں غازی علم الدین شہید کی نعش کے حصول میں بڑی دشواریاں پیش آئیں ہندو ہمارا دشمن اور انگریز ہندو کا دوست تھا ان نازک حالات میں ملت اسلامیہ نے جس حسن کارکردگی کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ حریت کا ایک سنہری باب ہے حصول نعش کے لئے مختلف جگہوں پر گرفتاریاں ہوتی رہیں اس سلسلے میں سب سے پہلے شہادت کے دن چند غیور مسلمان میانوالی سے گرفتار ہوئے واقعہ یوں ہے جب شہید مرحوم کی میت جیل سے باہر لائی گئی تو مسلمانوں نے چہرہ مبارک دیکھنے کے لئے چارپائی کے گرد گھیرا ڈال دیا مگر پولیس نے پر امن ہجوم کو منتشر کر دیا اور جنازے کو لاوارثوں کے قبرستان کی طرف لے کر چل پڑے۔ اس وقت مسلمان زور و شور کے ساتھ حکام سے مطالبہ کرنے لگے کہ میت ہمارے حوالے کرو! اس پر پولیس نے پتھر برسانا شروع کر دیئے اور ان کو لاٹھیاں بھی ماریں اس موقع پر چند سر فروش مسلمانوں نے جوابی کارروائی کی۔ جس سے ایک انگریز افسر کے دانت ٹوٹ گئے اور وہ شدید زخمی ہو گیا۔ روزنامہ انقلاب کے مطابق اس سلسلے میں پندرہ افراد گرفتار ہوئے جبکہ اس کی تصدیق نہیں ہو سکی اور صرف درج ذیل غازیوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں (۱) غازی فتح شیر بناریہ (۲) غازی نور محمد تائب (۳) غازی ابراہیم غریبت (پنجابی کے مشہور شاعر) (۴) غازی مستری غلام رسول (۵) غازی اللہ جوایا درزی (۶) غازی دوست محمد خان (شیرمان خیرطی) (۷) غازی ملک وسعت محمد مدرسے والا (۸) غلام حسن خان صاحب (انہیں چند گھنٹوں کے بعد رہائی مل گئی تھی)

میانوالی کے کلیم اللہ ملک صاحب اور خان محمد اصغر خان سے روایت ہے کہ گرفتار ہونے والوں میں سے دو ایک بری ہو گئے بقیہ کو چھ ماہ، ایک سال اور بعض کو ڈیڑھ سال قید کی سزا ہوئی

سنائی گئیں اس واقعے کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ عدالت میں غازی ابراہیم غریب نے اپنا بیان پنجابی اشعار میں قلمبند کرایا۔ جس کا ایک ایک شعر دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کر دیتا ہے لاہور میں حصول میت کی تحریک کے دوران وزیر مالیات نے مسلمانوں کے ایک وفد سے جب سرد مہری کا مظاہرہ کیا تو ۶ نومبر کو مسجد وزیر خاں میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا امیر بخش پہلوان اور مولانا ظفر علی خاں کی شعلہ بیانیوں سے ایوان حکومت میں زلزلے بپا ہو گئے۔ اس روز سترہ آدمیوں پر مشتمل پہلا دستہ میانوالی روانہ ہوا۔ ان رضاکاروں نے حلف اٹھا رکھا تھا کہ ہم لاش لے کر رہیں گے بصورت دیگر اپنی قبر بھی وہیں بنوائیں گے جہاں شہید رسالت آرام فرما رہے ہیں پہلے دستے میں شامل بعض سرفروشان اسلام کے اسمائے گرامی یہ ہیں (۱) محمد رشید (۲) نیک محمد (۳) محمد صدیق (۴) چنن دین (۵) خورشید انور (فرزند دلبند خواجہ فیروز الدین بار ایٹ لا) حصول نعش کے لئے گورنر کی کوٹھی پر دھاوے اور مقابلے کا پروگرام بھی بن چکا تھا۔ ۶ نومبر کو پہلے جتھے میں شامل مجاہدین کا اعلان کر دیا گیا تھا کہ فلاں فلاں گورنر کی کوٹھی پر مورچہ بندی کریں گے اس سلسلے میں کشمیری بازار کے تاجروں نے سول نافرمانی کرنے والے وفود کے تمام اخراجات اپنے ذمے لگا رکھے تھے مگر خوش قسمتی سے حکومت نے دور اندیشی کا ثبوت دیا۔ جس سے گورنمنٹ کے ساتھ تصفیہ ہو گیا اور بعد ازاں یہ پروگرام معرض التوا میں پڑ گیا۔ پہلے جتھے میں شامل سرفروشوں کی فہرست یہ ہے (۱) امیر بخش پہلوان بھاٹی دروازہ لاہور (۲) محمد رمضان ولد عمر بخش حویلی میاں خان (۳) محمد اسحاق ولد خان صاحب (۴) میراں بخش ککے زئیاں (۵) محمد امین ولد میاں عبداللطیف باغبانپورہ (۶) ایم محمد اشرف ولد میاں مہر دین محلہ بٹرنگاں کوچہ بھویاں بھاٹی دروازہ لاہور (۷) غلام مصطفیٰ ولد محمد حسین محلہ ککے زئیاں (۸) محمد جمیل ولد فضل دین خرادی محلہ (۹) عبداللہ ولد بڈھا محلہ بٹرنگاں گلی بھوریاں (۱۰) خیر دین ولد عبداللہ کوٹلی پیر (۱۱) عبدالرحمان ڈاکخانہ باغبانپورہ (۱۲) ایم کرامت بیگ ولد فوجدار بیگ حویلی کابلی مل (۱۳) محمد اشرف خان ولد فیروز خان کوچہ ککے زئیاں (۱۴) مرزا احمد خان ولد مرزا علی احمد خاں پشاور سٹی ٹھیکیدار (۱۵) کرم بخش ولد ماہی قوم گوجر اکبری دروازہ (۱۶) مولوی تاج الدین ولد کریم بخش محلہ ساد ھواں (۱۷) ایم اللہ دتہ ولد مستری نور دین ملازم مسلم کمپنی چنگڑ محلہ لاہور۔

غازی علم الدین شہید کا مقدمہ کسی فردِ واحد سے منسلک نہ تھا۔ بلکہ پوری قوم شمع رسالت کے پروانے کو بچانے کے لئے سر توڑ کوششیں کرتی رہی۔ جب اس جانباز عاشق نے جام شہادت نوش فرمایا تو حصول نعش کی خاطر سینکڑوں سر فروش کفن بدوش میدان عمل میں آ گئے ان میں کالجوں کے مسلمان طالب علم بھی سر فہرست تھے مولانا ظفر علی خان نے ابتدا میں حصول میت کے مطالبے کی مخالفت کی مگر فوراً ہی وہ رضا کاروں کی ٹولی میں آ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سب سے آگے نکل گئے ان مقاصد کے لیے بنائی جانے والی کمیٹی میں میوزک ڈائریکٹر خورشید انور اور رشید عطرے بھی پیش پیش تھے جب راقم الحروف اس سلسلے میں اپنی قوم کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا ہے تو حیرت کی انتہا نہیں رہ جاتی۔ حصول نعش کے لئے چلائی جانے والی تحریک کے صرف پندرہ دنوں میں گورنر پنجاب کو شہید مرحوم کے والد میاں طالع مند کے نام سے جو ٹیلیگرام موصول ہوئے صرف ان کی تعداد چار ہزار پانچ سو سے زیادہ تھی علاوہ ازیں یہ بھی قابل تحریر ہے کہ شہادت کے روز سے واپسی کے دن تک میانوالی میں غازی علم الدین شہید کی قبر پر گیس کی روشنی ہوا کرتی اور پولیس کا بھاری پہرہ رہتا۔ دراصل حکومت مسلمان قوم کی طرف سے خاصی خوف زدہ تھی۔ با ایں ہمہ پیر غلام دستگیر نامی کے الفاظ میں "یہ ممکن ہی کب تھا۔ کہ عاشق رسول الثقلین کی خواہش کہ اس کا مزار لاہور ہی میں بنے پوری نہ ہو۔ اگر وہ لاہور ہی میں شہید کر دیا جاتا تو خدا نے جس قدر اس کا نام کرنا تھا نہ ہوتا۔ جوں جوں اس کی وصیت کی تکمیل میں تاخیر واقع ہوئی مسلمانوں کی محبت اور عقیدت میں اضافہ ہوتا گیا ملک میں شورش پیدا ہو گئی۔ اور لوگ جتھے بنا بنا کر میانوالی جانے پر آمادہ ہو گئے حکام کو خطرہ ہوا کہ مسلمان اگر نعش کو نکال کر لے گئے تو بڑی کرکری ہو گی پس قبر پر گیسوں کی روشنی کی گئی اور اس کی پاسبانی کے لئے سپاہی متعین کر دیئے گئے۔ شہید کے مزار پر جو رونق اور چراغاں مسلمانوں کو کرنا تھا اس کا آغاز خدا نے حکام کے ہاتھوں میانوالی ہی میں کرا دیا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کشتۂ محبت کا مزار ہو اور کس پرسی کی حالت میں رہے غیر ممکن ہے۔ یہ دشمنان رسول کی قبور کے لئے مقدر ہے کہ گدھے لیٹیں اور الو بولیں علم الدین کی قبر ب... رونق کا منظر کیوں بنتی"

نعش کو میانوالی سے لاہور لانے کی خاطر ایک وفد تشکیل دیا گیا مسلمانوں کی طرف سے سید مراتب علی حسنی اور مرزا مہدی حسین مجسٹریٹ مقرر ہوئے جبکہ حکومت کی طرف سے پولیس انسپکٹر مرزا غلام حسین نگران تھے تینوں حضرات کی موجودگی میں ڈپٹی کمشنر راجہ مہدی زماں خان کے سامنے ۱۳ نومبر کو نعش قبر سے نکالی گئی۔ اس سلسلے میں تمام آداب ملحوظ خاطر رکھے گئے کسی اوزار کھرپے کا مطلقاً استعمال نہ ہوا۔ بلکہ علامہ محمد اقبال کی ہدایت کے مطابق میانوالی کے مستری نور دین اور اس کے دو تین ساتھیوں نے گڑھے کی معطر خاک ہاتھوں سے ہٹائی۔ وہ منظر ایمان افروز تھا اور عجیب بھی۔ میت بالکل صحیح سلامت تھی تیرہ دن گزر جانے کے باوجود اس میں تعفن یا بو پیدا نہ ہوئی۔ ارکان وفد کا بیان ہے شہید کا چہرہ جلال و جمال کا امتزاج اور نور و نکہت کی آماجگاہ تھا۔ ان کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک واضح لکیر نظر آتی تھی اس گڑھے سے ایسی مسحور کن خوشبو آتی۔ کہ احساس ہوتا بہشت نعیم کے دریچے وا ہیں۔ یا کوئی کافور و گلاب چھڑک رہا ہے لاش کے لیے جست کا بنا ہوا ایک صندوق موجود تھا۔ جو اسلامیہ کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر محمد الدین تاثیر کی نگرانی میں نیشنل کالج آف آرٹس سے تیار ہوا اس میں روئی بچھا کر تکیے لگا دیئے گئے اور کافور چھڑک دیا گیا نعش خود سید مراتب علی حسنی نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر ہزار احترام کے ساتھ تابوت میں رکھی وہ شوخیٔ نظارہ بھلا الفاظ کے آئینے میں کیسے اتر سکتی ہے۔ جہانِ رنگ و بو کا ذرہ ذرہ سرتاپا چشم بن گیا آفتاب کی پیاسی شعاعیں بوسے ثبت کرتی تھیں چشم فلک کو یک لمحہ محرومی بھی ناگوار خاطر تھی۔ حوریں شراب دید کی خاطر جنت کے باغوں سے نکل آئیں۔ فرشتوں نے شہید ناز کے نورانی چہرے سے نقاب اٹھا دیا۔ عشاق حقیقی خراج تحسین پیش کرنے لگے۔ کائنات کی رعنائیاں خود فراموشی کے عالم میں جھوم اٹھیں ہوا کے مست جھونکے جسد منور کے طواف میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور گڑھا بھی اس فدا کار کی جدائی کے غم میں ماتم کناں تھا۔ نور و نکہت کا ایک سیل رواں لمحہ بہ لمحہ چار سو پھیلتا جا رہا تھا۔ میانوالی اور مضافات کی فضا پر وجدان کی کیفیت طاری تھی۔ بوڑھے سرتاپا شوق تھے معصوم مچل اٹھے مستورات میں سرگوشیاں ہوئیں اور جوان تصویر حیرت بن گئے ہر فرد اس انوکھے عطر فروش کی تلاش میں نگاہوں کے تیر چلانے لگا۔ جب اضطرابی کیفیات حد سے بڑھیں تو عورتیں چادروں میں لپٹی ہوئی اپنے گھروں سے باہر نکل آئیں ضعیف العمر لوگوں کے قدم خود بخود

اٹھنے لگے اور جوانوں کو کوئی غیر مرئی قوت کھینچ لائی دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر اکٹھا ہو گیا۔ نور و نکہت کا معمہ حل ہوا آج ان کا مہمان الوداع ہو رہا تھا وہ مہمان جس کی آمد پر انہوں نے دل و نگاہ کا فرش بچھایا تھا۔ آنکھوں میں جذب اور دل میں برداشت کی سکت نہ رہی۔ دیدہ گریاں رخصتی کا نظارہ نہ کر سکیں۔ دل کے آئینے اس جانگداز منظر سے دھندلا گئے شوق و غم کی جانے وہ کیا کیفیت تھی ان کا جی چاہتا تھا کہ اپنے مہمان کو جانے نہ دیں لیکن اس کے باوجود وہ روک نہ سکے راہ حق کا شیدائی ایک صندوق میں محو خواب تھا جو موٹر میں رکھ کر میانوالی ریلوے سٹیشن پر پہنچایا گیا جہاں پہلے ہی ایک خاص گاڑی اسے لاہور لانے کے لئے تیار کھڑی تھی میانوالی میں جب صندوق موٹر میں رکھا جانے لگا تو سب سے پہلے غلام محمد عرف گاما نائی نے کندھا دیا اسپیشل ٹرین میں ایک ڈبہ فرسٹ کلاس کا ایک سیکنڈ کلاس اور دو بوگیاں لگائی گئی تھیں یہ شام ساڑھے چار بجے میانوالی سٹیشن سے روانہ ہوئی کتاب ضبط کا ایک ایک ورق بکھر گیا دل کے بحر ناپیدا کنار میں مدوجزر کی کیفیت پیدا ہوئی۔ گوہر ہائے اشک آئینہ بینائی کے ساحل پر آ گئے ایک شور ماتم بپا ہوا۔ آہ و فریاد کا طوفان تھا فضا چیخوں سے معمور تھی صبر و قرار کا نازک آبگینہ چور چور ہو گیا اور فضائے بسیط کا سینہ زخمی نظر آیا۔ بہر صورت گاڑی رات کو ایک بجکر چالیس منٹ پر لالہ موسیٰ اسٹیشن سے گزری، ۱۴ نومبر کو پانچ بجکر پینتیس منٹ پر یہ گاڑی راستے میں کسی اسٹیشن پر نہ ٹھہرتے ہوئے لاہور پہنچی اور چھاؤنی کے اسٹیشن سے دور نہر کے پل پر کھڑی ہو گئی۔ یہاں جیل کی دو لاریاں پہلے ہی موجود تھیں۔ اس مقام پر نعش کو سنٹرل جیل کے حکام نے سنبھال لیا۔ جنہوں نے پونے سات بجے پونچھ ہاؤس کے سامنے وہ صندوق مسلمان معززین کے حوالے کر دیا۔ سر محمد شفیع، علامہ محمد اقبال اور چند میونسپل کمشنروں نے وصولی کی رسید پر اپنے دستخط ثبت کر دیئے اور وہاں سے میت سات بجے کے قریب چوبرجی کے میدان (جنازگاہ) میں لائی گئی اس سے پہلے ۱۳ نومبر کو منادی کے ذریعے پورے شہر میں اعلان کرایا جا چکا تھا کہ شہید علم الدین کی نعش ۱۴ نومبر کو ساڑھے آٹھ بجے صبح چاند ماری گراؤنڈ میں مسلمانوں کے حوالے کی جائے گی اس لئے خلیفہ شجاع الدین، چودھری فتح شیر، میاں مبارک دین شیخ جان محمد، مہر خدا بخش، چودھری اللہ دتہ اور مسٹر رچرڈز واٹر والس انجینئر نے وہاں جا کر پانی کا انتظام کیا اور نماز جنازہ کے لئے صفیں کھڑی کرنے کی جگہ پر لکیریں لگا دیں۔

ملّی دولہا کی پرشکوہ برات

- یہ روزِ جشن ہے، یومِ ماتم نہیں
- مولانا ظفر علی خاںؒ قبر میں
- حجلۂ عروسی

تیری دوستی سے پہلے مجھے کون جانتا تھا
تیرے عشق نے بنایا، میری زندگی فسانہ

بارہ بجے کے بعد جب نعش قبر میں اتاری گئی
اس وقت ہوائے یثرب خاک لحد کو سرکار مدینہ ؐ کا یہ حکم سنا
رہی تھی۔ خبردار! میرے شہید کا کفن بھی میلا نہ ہونے پائے

میانوالی سے لاہور کا سفر بڑی شان و شوکت سے طے ہوا۔ ہر اسٹیشن پر ہزاروں مسلمان صرف گاڑی کی زیارت کے لئے دور دور سے آئے ہوئے تھے عوام نے اپنے شہید پر جگہ جگہ عقیدت کے پھول نچھاور کئے اور دعائیں مانگیں، شہید ناز کا استقبال کرنے اور نماز جنازہ پڑھنے کی خاطر لاکھوں مسلمان بلا امتیاز عقیدہ و فرقہ موجود تھے۔ جنازے میں پورے برصغیر سے ہر طبقہ اور پیشے کے لوگ شریک تھے۔ بیرون جات سے لاہور کے مضافات کے دیہاتی باشندوں کے علاوہ امرتسر، گورداسپور، پشاور، عیسیٰ خیل، موسیٰ خیل، انبالہ، لدھیانہ، میانوالی، جالندھر، گوجرانوالہ، گجرات، راولپنڈی اور دیگر علاقوں کے مسلمان کثیر تعداد میں شامل ہوئے اس روز مسلمانوں کا ضبط و نظام بھی حیرت انگیز تھا۔ جنازہ گاہ میں جوں جوں ہجوم بڑھتا جارہا تھا۔ لوگ خود بخود قطاروں میں بیٹھتے جاتے شہید کے جنازے میں خصوصاً لاہور اور عموماً برصغیر پاک و ہند کے مسلم معززین اور اخبارات کے ایڈیٹر بھی موجود تھے مقامی دفاتر کے مسلمان ملازمین اور کارخانوں کے مزدور بغیر چھٹی لئے چلے آئے تھے۔ اس زمانے میں پرانی انار کلی اور چوبرجی کے درمیان آبادی نہ تھی بلکہ اس جگہ میدان اور کھیت تھے کسانوں نے پانی کی قلت کے پیش نظر رہٹ چلا رکھے تھے۔ ٹیوب ویل سے میونسپلٹی کے انجن بھی پانی نکال رہے تھے اور ماشکی بڑی تندہی سے وضو کرانے میں مصروف تھے علاوہ ازیں اس موقع پر پولیس اور فوج کا زبردست انتظام تھا۔ برطانوی فوج کے دستے اہم راستوں اور چوراہوں پر چوکس و تیار کھڑے تھے بعض جگہوں پر نصب شدہ توپیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ پولیس ملازمین کے علاوہ مختلف جگہوں پر ہندو مسلم معززین کی ڈیوٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ حفظ امن کی خاطر لوہاری دروازہ سے سید مٹھا بازار تک چوک رنگ محل، سوتر منڈی، چوک متی، کشمیری بازار، پاپڑ منڈی، پرانی کوتوالی اور بڑی کوتوالی تک ذمہ دار افسر متعین تھے۔

وہ نہایت ایمان پرور نظارہ تھا۔ جن خوش نصیبوں نے خواجہ کائنات ؐ کے شیدائی کی بارگاہ میں آخری عقیدت و نیازمندی کے پھول پیش کئے ہیں اور جن ارادت کیش نگاہوں نے فدائی رسالت کی رعنائیوں کے بوسے لئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ الفاظ کا کوئی ذخیرہ، ادب کا ہر خزانہ، قوت بیاں کی کوئی وسعت، اور استعداد اظہار حقائق کی تمام پہنائیاں اس کا نقشہ نہیں اتار سکتیں

وہاں لاکھوں مسلمان موجود تھے۔ ہر ایک کا قلب و ذہن ہر شخص کی زبان اور آنکھیں سرور لولاک کے شہید کی عقیدت سے لبریز تھیں۔ آخری وقت تک آمد کا تانتا بندھا۔ ہا ہزاروں خواتین جنازے میں شامل ہوئیں اور سینکڑوں زیارت کے لئے ابھی چلی آ رہی تھیں۔ نگاہ جس طرف کا نظارہ کرتی مسلمان ہی مسلمان نظر آتے میت کے لئے چارپائی ڈاکٹر محمد الدین تاثیر نے ازراہ عقیدت پیش کی اور تابوت نیشنل کالج آف آرٹس میں سرکاری طور پر تیار ہوا جنازے کی کیفیت دیدنی تھی چارپائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس بندھے ہوئے تھے اور چارپائی پر پھولوں کا بستر تھا اور اس سہری پر ایک چوبی صندوق تھا۔ جو طرح طرح کی خوشبوبات سے معطر تھا اس صندوق میں ہر اندیشہ اختلال سے محفوظ تنہائی میں ایک بظاہر کا ملاً خاموش مگر حقیقتاً" ہمہ تن گویا وجود علی الاعلان گواہی دے رہا تھا اور زمین کی وسعت میں بسنے والے ہر زندہ وجود اور سطح ارض سے لے کر عرش اعلیٰ تک ہر سامع ہستی کو سنا رہا تھا کہ ناموس رسالت پر قربان ہونے والے ابھی باقی ہیں اس تابوت پر ایک سیاہ چادر تھی جس کے بالائی حصوں پر سادہ نمونے کندہ تھے اور حاشیوں پر یہ شعر کڑھا ہوا تھا۔

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم

"سنا ہے کہ قیامت کے دن جب نفسا نفسی کا عالم ہو گا تو خدائے کریم برے لوگوں کو بھی محض نیک خصلت افراد کی وجہ سے بخش دے گا"

⭘

سیاست اخبار کے مدیر و مالک مولانا سید حبیب شاہ ایک جید عالم، مقبول رہنما اور حضور رسالت مآب کے عاشق صادق تھے حضرت علامہ محمد اقبال نے آپ سے پوچھا کہ وہ خوش نصیب کون ہے جسے شہید کی نماز جنازہ پڑھانے کا شرف حاصل ہو گا۔ مولانا سید حبیب شاہ صاحب نے فرمایا یہ تو شہید کے والد بزرگوار میاں طالع مند کا حق ہے جانے ان کی نگاہ کس مہ جبین کی طرف اٹھتی ہے۔ میاں طالع مند پاس ہی کھڑے تھے انہوں نے کہا اگر یہ حق مجھے حاصل ہے تو میں اسے ڈاکٹر محمد اقبال کو تفویض کرتا ہوں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب اور سید حبیب شاہ نے باہمی مشورے سے سن رسیدہ

عالم دین مولانا سید محمد دیدار علی الوری کا انتخاب کیا۔ مگر مولانا موصوف ملت اسلامیہ کے جم غفیر میں اس قدر گھر چکے تھے کہ بروقت مقررہ جگہ پر نہ پہنچ سکے اس لئے مسجد وزیر خان کے خطیب قاری شمس الدین بخاری کا نام تجویز ہوا۔ جس پر سب حاضرین نے بصد شوق و مسرت رضامندی کا اظہار کیا اتنے میں مولانا محمد دیدار علی شاہ الوری بھی سید آحمد شاہ کی معیت میں تشریف لائے ان کو اس قصہ کا ماجرا سنایا گیا آپ نے فرمایا "جو ہوا خوب ہوا ہے" اس ایثار سے فرشتے تصویر حیرت بن گئے اہل دل نے ہاتھوں کو اپنے اپنے دل پر رکھ لیا۔ اور مہ وشوں کی سرمہ آلود پلکوں پر آب پارے جھلملانے لگے۔ انہی کیفیات میں پہلا جنازہ پڑھانے کا شرف قاری محمد شمس الدین کو حاصل ہوا اس کے بعد دوسری نماز جنازہ سید محمد دیدار علی شاہ الوری صاحب نے پڑھائی جب جنازے کی نمازیں ختم ہوئیں تو حاضرین کی بیقرار نگاہیں تابوت کا طواف کرنے لگیں مولوی غلام محی الدین قصوری، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، سر مراتب علی حسنی، مولانا ظفر علی خاں، سر عبدالقادر، سید عنایت اللہ شاہ، اور مولانا حبیب شاہ ارادت کیش آنکھوں سے سرور لولاکؐ کے فدائی کا نظارہ کرنے لگے سر میاں محمد شفیع وفور جذبات سے بے قابو تھے وہ مجسمہ ادب بنے ہوئے سامنے کھڑے ہو گئے اس وقت ان کے حلقہ چشم سے موتی اچھل رہے تھے آپ نے آقائے نامدارؐ کے حضور میں درود و سلام کے گلدستے پیش کئے پھر شہید رسالتؐ کی بارگاہ میں خراج تحسین پیش کیا اور زائرین کو نظم و ضبط کی تلقین فرمائی۔

اتنا بڑا عظیم الشان پرشوکت اور متین و ضابط اجتماع پنجاب کی آنکھوں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ایسا روح پرور منظر کہ چشم فلک کو جنبش مژگاں بھی بار تھا۔ ساڑھے دس بجے جنازہ اٹھایا گیا ہزاروں لوگ کندھا دینے کے اشتیاق میں جوق در جوق آگے بڑھے علامہ اقبال اور سید حبیب ایسے رہنما ایک لمحہ تابوت اٹھانے کی جستجو میں آگے پیچھے دوڑ رہے تھے تمام اکابرین ملت کے دل میں یہی آرزو مچل رہی تھی بڑے بڑے زعمائے کرام کندھا دینے والوں کے قدموں میں گر گر کر اٹھ اور اٹھ اٹھ کر گر رہے تھے اسی شوق جستجو میں مولانا ظفر علی خاں، اور سر میاں محمد شفیع بھی زائرین کی زد میں آ گئے جنہیں بمشکل وہاں سے نکالا گیا۔ ہزاروں لوگ جو اس شرف سے محروم رہے انہوں نے اپنی پگڑیاں بانسوں میں

ڈالے ہیں۔ ہرطرف زائرین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں برقعہ پوش خواتین بھی جمع تھیں۔ جو ایک نظارہ کرنے کی خاطر اونچے ٹیلوں اور چھتوں پہ بیٹھی درود وسلام پڑھ رہی تھیں بقیہ پیر لودیاں والا کے دربار میں جمع تھیں راستے میں جگہ جگہ پہ میت پر پھولوں کی بارشیں ہوتی رہیں ہزاروں عقیدت مند جھولیوں، ٹوکریوں اور ٹوپیوں میں تروتازہ پھول بھر بھر کر لائے تھے اور بعض گلاب، چنبیلی، موتیا اور رابیل کے عطر و عرق کی بوتلیں انڈیل رہے تھے ہر شخص وفور جذبات کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ہر لمحہ کلمہ شہادت کی پکار سے فضا گونج رہی تھی چاروں سو اللہ اکبر اور شہید علم الدین زندہ باد کے نعرے سنائی دیتے تھے بعض لوگ "بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم" کا ورد کرتے ہوئے جنازے کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے کئی من پھول اور عطر و عرق کی سینکڑوں بوتلیں آپ کے جسد منور پر چھڑکی گئیں اخبارات ضمیمے چھاپ کر عوام کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کر رہے تھے اور تجہیز و تکفین تک ایک ایک گھڑی کی کاروائی کو سپرد قلم کرتے رہے زائرین کا محتاط اندازہ چھ لاکھ کیا جاتا ہے بحوالہ انقلاب جنازے کا جلوس ساڑھے پانچ میل سے زیادہ رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ ساڑھے دس بجے تک لوگوں کی تعداد ساڑھے چار لاکھ سے زائد تھی اور ابھی آمد کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ پہلی نماز کے اختتام پر کثیر التعداد لوگ جنازہ گاہ سے آ رہے تھے لیکن جس تعداد میں لوگ واپس جا رہے تھے اس سے زیادہ تعداد میں زیارت کے لئے آ رہے تھے ستر ستر اسی اسی سال کے بوڑھے جن کی کمریں کہولت سن کی وجہ سے جھک گئی تھیں، اور راہیں، قدم اٹھانا بھی دشوار تھا بے تابانہ وہاں پہنچے اور شہید ناز کے نظارے سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیں پہلی نماز جنازہ میں تین سو تیرہ صفیں مرتب ہوئیں ہر صف میں دو ہزار کے قریب زائرین کھڑے تھے قصہ مختصر جلوس نے چوبرجی سے قبرستان تک آدھے میل کا فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا قبر مولانا ظفر علی خاں نے خاص اپنی نگرانی میں بنوائی جب لحد میں اتر کر آپ جسامت کا جائزہ لینے لگے تو ایک چیخ بلند ہوئی مولانا کی چیخ اس فریاد و ارمان کا امتزاج تھی کاش! یہ مقام آج مجھے نصیب ہوتا"۔ اس کے بعد مولانا موصوف ناکام ارمانوں اور اپنی حسرتوں کا لاشہ اٹھائے لحد سے باہر آ گئے ہر آنکھ پرنم تھی چشم فلک کو بھی ذوق گریاں نے ستایا اور رم جھم

ہونے لگی۔ اسی سماں میں مولانا سید دیدار علی شاہ اور سر علامہ محمد اقبال نے پاک میت کو اپنے دست ہائے مبارک سے قبر میں اتارا جس کے بعد قلندر لاہوری نے سرتاپا نیاز عرض کیا "غازی علم الدین شہید آتو خوش رہ ہم نے تیری وصیت کو پورا کر دکھایا نماز جنازہ میں ہر شخص نے کلمہ شہادت پڑھا اور دعائے مغفرت مانگی ہے دربار رسالت میں پہنچ کر آقا و مولا کی بارگاہ میں میرا سلام پیش کرنا اور اسلامی ممالک اور خصوصاً برصغیر کی سیاسی آزادی کے لئے دعا کرنا، اچھا خدا حافظ"، لوگوں نے فرط عقیدت سے قبر کے اندر اتنے پھول پھینکے کہ تربت بھر گئی اس کے بعد کچی اینٹوں سے تعویذ بند کیا گیا جب کلمہ شہادت اور درود و سلام پڑھ کر مٹی ڈالنے کی رسم ادا ہونے لگی تو فضا چیخوں اور فریادوں سے معمور تھی علمائے کرام پرنم آنکھوں سے ایسی موت اور مرنے والے پر رشک کر رہے تھے اقبال بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا شوق و غم کی ایک عجیب کیفیت تھی جس میں حسب وصیت مولانا سید دیدار علی شاہ کی اقتدا میں نماز شکرانہ کے دو نفل ادا کئے گئے۔ اسی روز جنازہ لانے سے قبل میاں طالع مند قبرستان میں آئے تو لوگ ان کے گرد پروانہ وار گھوم رہے تھے آپ کے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے گئے بارہ بجے کے بعد جب نعش قبر میں اتاری گئی۔ اس وقت ہوائے یثرب خاک لحد کو سرکار مدینہ کا یہ حکم سنا رہی تھی خبردار! میرے شہید کا کفن بھی میلا نہ ہونے پائے۔

ہے جس کی خلوتوں کا سہارا غم رسول
وہ گوشۂ لحد میں بھی تنہا نہیں ہوا

○

میت کی واپسی اور اس کے بخیر و خوبی دفن ہو جانے پر علم الدین کمیٹی کے سربراہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو حسب ذیل بیان دیا "ہم مسلمانان لاہور حکومت پنجاب بالخصوص سر جیافری ڈی مونٹ مورنسی گورنر کے ممنون ہیں۔ کہ انہوں نے غور و تدبر سے کام لیتے ہوئے غازی علم الدین شہید کی میت ہمارے حوالے کی اور ہم اپنی قوم کے غیور شہزادے کو حسب وصیت دفن کرنے میں کامیاب ہوئے ہم ان تمام حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جنہوں نے اس مرحلے کو بخوش اسلوبی طے کرنے میں ہماری مدد فرمائی اور امن و امان برقرار

رکھا،، اس بیان پر ذیل کے اکابرین وطن وملت کے دستخط ثبت تھے۔ سر میاں محمد شفیع حضرت علامہ محمد اقبال، خلیفہ شجاع الدین، سید محسن شاہ، میاں عبدالعزیز، میاں امیرالدین، ملک محمد حسین اور مولوی غلام محی الدین قصوری۔ اس روز مولانا ظفر علی خان ٹریفک کے نگران اعلیٰ تھے ان کی قیادت میں رضا کار عام طور پر اور ملک لال دین قیصر، حکیم احمد حسن اور غلام مصطفےٰ حیرت خاص طور پر اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے بعض لوگوں کی کچھ اشیاء ادھر اُدھر گر گئی تھیں رضاکاروں نے اعلان کیا کہ تمام گری پڑی اور لاوارث چیزیں ان کے کیمپ میں پہنچادی جائیں اس کیمپ کا انچارج استاد امیر بخش پہلوان تھا غازی علم الدین شہید کے قریبی دوست میاں سراجدین بھی انہی کی قیادت میں اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ استاد امیر بخش پہلوان نے فرض شناسی کا شاندار مظاہرہ کیا اور اپنی ذمہ داری کو بہ احسن سرانجام دیا۔ انہوں نے گمشدہ تمام اشیاء اصل مالکوں تک پہنچادیں۔ دس پندرہ دن بعد بھی لوگ اپنی گم شدہ جوتیاں اور دیگر چیزیں وصول کرتے رہے۔ پہلوان صاحب کی مساعی جمیلہ سے کسی فرد کی کوئی شے بھی ایسی نہ تھی جو واپس مالک تک نہ پہنچ گئی ہو۔

غازی علم الدین شہید کے جنازے کا اجتماع تاریخی اعتبار سے بھی بڑا اہم ہے غلامان مصطفےٰ کے جو جنازے بڑی دھوم دھام سے نکلے اور تاریخ نے جنہیں اپنے صفحات میں محفوظ کیا ہے ان میں سب سے پہلا بڑا جنازہ ابو حنیفہ امام اعظمؒ کا ہوا۔ آپ نے ۱۰ رجب المرجب ۱۵۰ ہجری کو وفات پائی۔ اسی روز آپ کا جنازہ چھ مرتبہ پڑھا گیا ایک روایت کے مطابق ہر دفعہ کم و بیش نوے ہزار انسان جنازے میں شریک تھے غائبانہ نماز جنازہ کئی دنوں تک ہزاروں جگہوں پر پڑھی جاتی رہی۔ معتبر تواریخ میں مذکور ہے کہ امام احمد بن جنبلؒ اور امام مالکؒ کے جنازوں میں بھی لاکھوں افراد شامل تھے۔ ایک اور عظیم جنازہ مولانا محمد جلال الدین رومیؒ کا تھا۔ آپ کا انتقال ۵ جمادی الاول ۷۰۲ ہجری کو شام کے وقت ہوا۔ رات بھر تجہیز و تکفین کی تیاری ہوتی رہی۔ صبح کو جنازہ اٹھا اور شام تک آپ کا جنازہ پڑھا جاتا رہا آپ کی وفات پر کوئی آنکھ نہ تھی جو روتی نہ ہو۔ ہر طبقہ و فرقہ کے خورد و کلاں شریک جنازہ تھے اور چودھویں صدی میں ایک بہت بڑا جنازہ لاہور کے غازی علم الدین شہیدؒ کا ہے جس میں ایک محتاط اندازے کے مطابق چھ لاکھ انسان شامل تھے۔ اس تعداد میں ہزاروں جگہ ادا کی جانے والی غائبانہ نماز جنازہ کا مطلقاً شمار نہ ہے

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

- آخری وصیت
- زندہ نقوش
- ملفوظاتِ شہید

تمہارے مرتبہ تک فکر کی پرواز کیا پہنچے
تو پھر میں کس طرح کہہ دوں کہ تم کیا ہو کہاں تم ہو

شب گزار زاہد سالہا سال سے مالا کے منکے گھماتے ہیں پریم نگر سے شناسائی نہیں ہوتی۔ عابد طویل مدت تک عبادت کرتے رہتے ہیں، مگر معبود کی ذات کے عارف نہیں ہوتے۔ لیکن جب خدائے ذوالجلال کی مشیت کسی انسان کا شکار کرتی ہے تو وہ سلوک کی تمام منزلیں چشم زدن میں طے کر جاتا ہے۔

غازی علم الدین شہید ایک فرد نہیں پوری قوم ہے وہ قوم جو ناموس رسالت کی محافظ ہے علم الدین نے جان پر کھیل کر اسلام کی عزت بچائی۔ اور خود اسلام کی عزت بن گیا۔ وہ شمع رسالت کا پروانہ تھا اب اس کے ہزاروں پروانے ہیں اس نے حرمت رسول کی خاطر زندگی کو قربان کیا آج اسکی عزت کیلئے سینکڑوں محافظ جانیں لڑانے کے لئے ہمہ وقت سینہ سپر ہیں۔ غازی علم الدین ہم سب کا تھا ہم سب اس کے ہیں وہ عشق رسالت کی ایک لافانی حقیقت ہے جس کی روشنی میں راہ حق کے مسافر اپنے عملی حقائق کا تعین کرتے ہیں۔ غازی علم الدین شہید اس مقام پر متمکن ہیں۔ جہاں آنکھ کو دید کی تاب ہے نہ زبان کو طاقت گویائی، یہ قلب وروح کا معاملہ ہے دیکھنے والے آنکھیں بند کر کے دیکھ لیتے ہیں اور سننے والے غیر مرئی طور پر سماعت کر سکتے ہیں شمع رسالت کے پروانے کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے جس کا ورق ورق غیرت وحمیت کا درس دے رہا ہے ان کو وہ مقام ورتبہ ملا۔ جس کی بڑے بڑے غازی آرزو کرتے رہے اور کفن بدوش مجاہد تلواروں سے کھیلا کرتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آن واحد میں وقت کا تیر کمان سے ایسا نکلا۔ نامی گرامی سیاست دان ہاتھ ملتے رہ گئے بڑے بڑے عالم دین مبہوت ہو گئے لیلۂ شب نے چاندی کے زیور اتار دیئے اور راہ حق کے متلاشی رشک کی شدت سے گھائل ہو گئے۔ شب گزار زاہد سالہا سال مالا کے منکے گھماتے ہیں۔ پریم نگر سے شناسائی نہیں ہوتی۔ عابد طویل مدت تک عبادت کرتے رہتے ہیں مگر معبود کی ذات کے عارف نہیں ہوتے۔ لیکن جب خدائے ذوالجلال کی مشیت کسی انسان کا شکار کرتی ہے تو وہ سلوک کی تمام منزلیں چشم زدن میں طے کر جاتا ہے اور اس کی نسبت سے ہر شئے متبرک اور یادگار بن جاتی ہے علم الدین کے مقدر کا ستارا چمکا۔ تو وہ غازی بن گئے اور پھر شہادت کا ارفع رتبہ عطا ہوا۔ اس لئے راہ حق کے مسافر کا قدم قدم یادگار ہے۔ غازی علم الدین کی سرکاری وصیت جو انہوں نے مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو بوقت نو بجے صبح یعنی تختہ دار پر کھڑے ہونے سے بیس گھنٹے پہلے سپرنٹنڈنٹ جیل کو مجسٹریٹ کی موجودگی میں لکھوائی اور کمشنر لاہور کے ذریعے میاں طالع مند کو پہنچائی گئی تاریخ کا

ایک حصہ ہے اور اس کے بغیر یہ داستان نامکمل رہے گی۔ چونکہ وصیت نامہ بعد از شہادت غازی علم الدین ورثا کو موصول ہوا۔ اسی مناسبت سے یہاں درج کیا جاتا ہے وصیت میں آپ نے لکھوایا وہ گزارش ہے میرے سب رشتہ داروں کو یہ تاکید کر دی جائے کہ میرے پھانسی مل جانے سے ان کے سب گناہ بخشے نہیں جائیں گے بلکہ ہر ایک کے اپنے اپنے عمل ہی اس کو دوزخ سے بچا سکتے ہیں۔ پس ان کے لئے عمل نماز قائم رکھنا اور اور جملہ احکام شرعی کی پابندی لازمی ہے۔ بھائی محمد الدین اور بھائی غلام محمد ! تم پر کسی نہ کسی وقت مصیبت ضرور نازل ہو گی اس واسطے تم ہر نماز کے بعد یا مزمل کا ورد کرنا۔ میری قبر کا فرش ۲ فٹ اونچا اور ۳۰ فٹ مربع ہو۔ میری قبر کا کٹہرہ جو سب تھڑے کے اردگرد ہو وہ ۱/۴ ۱ فٹ اونچا ہو۔ تمام سنگ مرمر کا بنایا جائے۔ ایک جانب سے ۱/۲ ۲ فٹ یا ۱/۲ ۲ فٹ کی جگہ کچی رکھی جائے۔ جس کے اردگرد جنگلہ لکڑی کا میرے والد بزرگوار کے اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا لگایا جائے۔ قبر اندر سے کچی رکھی جائے صندوق میں دفن کرنے کی ضرورت نہیں نیچے صرف ریت بچھائی جائے۔ جو آدمی میرے بعد میرے خاندان سے وفات پائے اس کی قبر میرے دائیں بنائیں تھڑے کے چاروں کونوں پر گلاب کے پودے لگائے جائیں باہر کی طرف دو کھڑکیاں بنائی جائیں اور کنواں بھی تعمیر کیا جائے اور وہاں پر مسجد بنائی جائے اس کا فرش میری قبر کے فرش سے کسی [illegible] نت میں کم نہ ہو۔ اور مجھے ملنے کے واسطے جو وظیفہ آپ کو بتایا گیا ہے وہ ہفتہ اور اتوار [illegible] میانی شب کو پڑھنا چاہیئے۔ جب دفن کر چکو تو دو نفل نماز شکرانہ اور نفل مغفرت کے واسطے ادا کرنا۔ میری لاش کے ہمراہ فساد بالکل نہ کیا جائے اور [illegible] امان کی تلقین کی جائے میری لاش کے ساتھ ذکر اللہ ہو ضرور ہو، مگر سر سے پگڑ[illegible] ی نہ اتارے۔ جو میری قمیض عدالت میں پڑی ہے وہ میرے ماموں سراج د[illegible] ئے [illegible] میری شلوار میرے بھائی محمد الدین کو دی جائے۔ اور یہاں [illegible] یں سے میری پگڑی میرے تایا صاحب (مہرالدین) کو دی [illegible] تایا نورالدین اور کرتی جھنڈو برادر بھیجے کو دی جائے اور سلیپر میرے [illegible] ہ دیئے جائیں اور سب بھائیوں کو السلام علیکم، میرا

سارا حال اخبار میں ضرور نکلوایا جائے اور نماز کی سب مسلمانوں کو تلقین کی جائے فرض اللہ عزوجل کا قرض ہے اور سنت جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ جو وظیفہ میں نے تم کو بنایا ہے وہ صرف میری تسبیح پر ہوگا اور کسی تسبیح پر نہ ہوگا وہ خلیل سے سنبھال لینا۔ ۵ ادانہ کی ہوگی یہ میری جملہ وصیت پوری کی جائے میں نے یہ قتل اس واسطے کیا تھا کہ اس نے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی (نعوذ باللہ) بے عزتی کی تھی۔

اشعار

۱۔ ہتھ یار دا نظر قرآن آیا، تاں پھر چمیاں ادب آداب کر کے
شالا ہتھ سڑے، ملے سزا مینوں ہتھ لایا جے بھیڑ نگاہ کر کے
قسم ہے رب دی دوستا آکھداواں قدمیں ساں ہیں دلربا کر کے
علم الدین جناب نے زبردستی دتا رتبہ تنے اپنی شفا کر کے

۲۔ ون ہفتے دا میں قربان جاواں اللہ بخشی سی اینہہ مراد مینوں
قسم رب دی بندہ نہ نال کوئی مدد دتی سی اللہ ذوالجلال مینوں
خنجر ماریا سی حکم رب دے نال ایہو دل دے وچہ مراد مینوں
علم الدین میاں ڈرنا موت تھیں نیئں جھنڈے نبی دے نال پیا مینوں

میانوالی میں جو تمہاری مدد ہوئی ہے اور جیل کے اندر ۲۵ قرآن شریف ۱۲ ہزار ورد شریف قیدیوں نے ختم کئے ہیں ان کا حوالہ اخبار میں دیا جائے،، اس تحریری وصیت کے علاوہ آپ لواحقین اور دیگر دوستوں کو پہلے ہی ارشاد فرما چکے تھے کہ میری قبر شرعی اصولوں کے مطابق تیار کرنا اس کی حفاظت کے لئے ایک چبوترا ۳ فٹ مربع اور ۲ فٹ اونچا بنوا لینا۔ تاکہ میرا نشان زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہے اور آنے والی نسلوں کی ایمانی جرأت کو برقرار رکھ سکے۔ میری قبر بغیر چھت کے ہو تاکہ روح اور استخواں کا تعلق قائم رہ سکے اور میری قبر باران رحمت کی بوندوں سے مستفیض ہوتی رہے۔ مجھے گلاب کے پھول سے خاصہ انس ہے اس لئے میری قبر کے چاروں کونوں پر گلاب کے گملے

رکھے جائیں۔

تبرکات کی تقسیم شہید مرحوم کی وصیت کے مطابق ہوئی۔ دیگر تبرکات و ملفوظات کی تفصیل یوں ہے میاں علم الدین غازی کا ایک رومال جو آپ سر پہ ایک خاص ادا سے سجایا کرتے تھے اور میانوالی جیل میں ان کے پاس تھا تا حال ان کے گھر والوں کی حفاظت میں موجود ہے۔ مٹی کا ایک پیالہ جس میں غازی صاحب پانی پیا کرتے تھے اور دوران اسیری جس کی تاثیر سے سینکڑوں مریض صحت یاب ہوئے۔ آخری ملاقات میں اسی برتن سے آپ نے رشتے داروں کی خاطر تواضع کی۔ وہ ان کی حقیقی بھتیجی محترمہ انور سعید صاحبہ کے پاس محفوظ ہے خلیل نامی میانوالی جیل میں ایک قیدی تھا جس کے حضرت غازی علم الدین کے ساتھ گہرے مراسم پیدا ہو گئے تھے آپ کی شہادت کے بعد ڈیڑھ سو دانوں کی تسبیح اسی سے حاصل کی گئی اب اس تسبیح کے صرف چھ دانے محفوظ ہیں جو ایک اور تسبیح میں پرو دیئے گئے ہیں دیگر دانے عقیدت مند اور مداحوں نے بطور تبرک اپنے پاس محفوظ کر لئے جناب علم الدین شہید کی قمیص اور شلوار میاں محمد الدین کے فرزند اکبر شیخ رشید احمد نے پہن لیں اور اس طرح وہ پھٹ کر ضائع ہو گئیں شہید رسالت کی تربت پر پہلی چادر ان کی ہمشیرہ معراج بیگم صاحبہ نے چڑھائی یہ چادر اوپر سے سبز اور نیچے سے سیاہ رنگ کی ہے۔ اس پر ایک نظم بھی کندہ ہے۔ جو اس نیک خاتون نے اپنے مبارک ہاتھوں سے کاڑھی۔ یہ یادگار چادر بھی ورثا نے ہزار احترام صد عقیدت سنبھال رکھی ہے۔ غازی موصوف حرف حرف شناس تھے جب قائداعظم مقدمے کی پیروی کے لئے تشریف لائے تو آپ نے وکالت نامہ پر دستخط کئے جس کا ریکارڈ لاہور ہائی کورٹ میں دیکھا جا سکتا ہے

شہرت یافتہ شخصیتوں کا خراج تحسین

- پارۂ نثر
- حصۂ نظم

کوئی نہیں جو مزاج حروف جانتا ہو
اگرچہ یوں تو ملے ہیں سخن شناس بہت

"دولت کا لالچ کیا ہے۔ نہ میرے دل میں کبھی حکومت کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں کسی دنیاوی حاکم سے آج تک مرعوب بھی نہیں ہوا۔ حمد و نعت کی رنگینی میں میری تار نفس بجتی رہتی ہے۔ میں نے کسی سے آگے بڑھ جانے کے متعلق بھی نہیں سوچا۔ حسد کی آگ سے خدائے قدوس نے مجھے ہمیشہ محفوظ رکھا ہے۔ مگر غازی علم الدین شہید کا حال دیکھ کر میرے دل میں اس آرزو نے انگڑائی لی کہ کاش! یہ موت مجھے نصیب ہوتی۔"

غازی علم الدین شہید کے حقیقی بھتیجے شیخ رشید احمد کا بیان ہے "میں جب جہاں اور جس جگہ بھی گیا۔ ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے میری راہ میں نگاہوں کے فرش بچھائے۔ بڑے بڑے شیوخ عظام نے اپنی خاص توجہ کا مستحق سمجھا ہے۔ مولانا آزاد اور امیر شریعت سید عطاء اللہ بخاری ایسے زعمائے کرام مجھے ہمیشہ سینے سے لگایا کرتے"۔ غازی علم الدین شہید کو ہر طبقہ اور ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان کے اسماء کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اس لئے چیدہ چیدہ عقیدت کیش حضرات کا انداز تحسین قید تحریر میں لایا جاتا ہے۔ اس سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ جملہ مضامین کے مواخذ حاجی نیاز احمد میاں، شیخ رشید احمد بعض کتب، پارینہ اخبارات اور سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی روایات ہیں۔ ہاں! عموماً خیالات کو جامۂ الفاظ محرر سطور نے خود پہنایا ہے۔

۱۔ مولانا غلام محمد ترنم مرحوم صاحب امرتسری! آپ کی بلندی شہادت پرازن سخن نہیں۔ میری چشم فکر نے سینکڑوں شہدا کی خوبی و حسن کو دائرہ گماں میں محیط کیا ہے۔ مگر حضور رسالت مآب کے اس لاڈلے کا تصور باندھتے ہی آنکھوں میں قطرہ ہائے شبنم جھلملانے لگتے ہیں اور جذبہ عشق کہتا ہے غازی علم الدین شہید پرندے کی صورت روضہ رسولؐ کے پاس چہچہا رہے ہیں۔

۲۔ حضرت پیر حافظ محمد ضیاء الدین صاحب سیالوی! غازی علم الدین فنا فی الرسول تھے بوقت ملاقات میں نے ان کے لبادے میں کوئی اور ہستی دیکھی۔ انہیں علم لدنی حاصل تھا اور وہ کائنات کے تمام رموز و اسرار سے واقف تھے۔

۳۔ میاں سراج دین صاحب! میں اپنے دوست غازی علم الدین شہید کا جنازہ پڑھنے والوں کے جوتوں کی نگرانی کرنے والے کیمپ کا رکن تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے اور میں خود کو بلندیوں میں اڑتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ مجھے توقع ہے۔ خدائے کریم شہید کی دعا سے مجھے بھی بخش دیں گے۔

۴۔ حضرت استاد عشق لہر مرحوم! چودھویں صدی ایسے زمانے میں آپ نے عشق رسولؐ کا عملی ثبوت دے کر اپنے نام کو خوب روشن کیا ہے۔ وہ کوہ طور کا ایک مقدس ذرہ تھا۔ جو عشق والوں کی آنکھ کا سرمہ بن گیا ہے۔ بے شک غازی علم الدین شہید منصور بن حلاج کا ساتھی ہے۔

۵۔ راجہ زمان مہدی خاں! سزائے موت پانے والے تمام قیدی بالعموم حواس باختہ ہو جاتے ہیں مگر میں نے غازی علم الدین ایسا اطمینان قلب کسی اور میں نہیں دیکھا۔ ہونٹ ہر وقت تبسم کناں، ان کی

دل ہمہ وقت، صبر و استقلال سے معمور چہرہ ہر لحظہ پر رونق اور ان کی نگاہیں ہر آن رسالت مآب کے دیدار کے لئے بے قرار رہتی تھیں۔ شہید موصوف کی فضیلت کے سلسلے میں مجال گویائی نہیں ہے۔

۶۔ مولانا سید حبیب شاہ صاحب! بطل حریت، فخر دین و ملت، پروانہ شمع رسالت حضرت علم الدین شہید کا مقام و رتبہ یکتا ہے۔ وہ ہم مسلمانوں کا ورثہ ہیں۔ ملت اسلامیہ پر ان کا ایک عظیم احسان ہے۔ آپ کی عزت ہماری عزت ہے اور خدا اور رسولؐ کی عزت ہے۔

۷۔ حافظ مقبول احمد صاحب! شہباز طالع مند جو طالع آزمائی کیلئے کوچہ سر فروشاں کی منڈیر سے پرفشاں ہو کر اٹھا، اڑا، جھپٹا، مردود رسالت پناہ کا شکار کرتا ہوا لوٹا، دُربار دریتیم کی چوکھٹ چومی اور شاخ طوبیٰ پہ جا بیٹھا۔ یہی غازی علم الدین شہید ہے۔

۸۔ نواب عطا محمد مرحوم کالا باغ! غازی علم الدین سے ملاقات کرنے کو میرا بار بار جی چاہتا جب تک میری نگاہیں ان کے پر جلال چہرے کے بوسے لیتی رہتیں۔ مجھے دنیا و مافیہا ..... کی کوئی خبر نہیں ہوتی تھی۔ اہل ایمان اس بات پر بڑی آسانی سے یقین کر سکتے ہیں۔ کہ اپنے فدائی کی تسکین کے لیے ایک ہستی میانوالی جیل میں تشریف لایا کرتی تھی۔

۹۔ حضرت علامہ محمد اقبالؒ! ہم باتیں ہی بناتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ترکھان لڑکا بازی لے گیا" "اسی گلاں کردے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا"۔

۱۰۔ استاد اللہ لوک مرحوم (پنجابی شاعر)! علم الدین غازی حضوری تھے۔ چھوٹی سی عمر میں وہ ایک عظیم منصب پر فائز ہو گئے۔ اب جس بزم میں وہ شب و روز حاضر رہتے ہیں۔ وہاں شب بیدار زاہد اور عمر رسیدہ عامل بھی باریابی حاصل نہیں کر سکے۔

۱۱۔ باوا عارف حسین امیر! خاکم بدہن جو غازی علم الدین کو شہدائے کربلا کا ہم مرتبہ ٹھہراؤں۔ مگر میرا عقیدہ ہے۔ امام عالی مقام کی کمال شفقت سے وہ آپ کے جانثاروں کی صف میں شامل ہیں۔ اور ہمہ وقت شہسوار ذوالجناح کی بزم ناز میں جلال و جمال کے بوسے لیتے رہتے ہیں۔

۱۲۔ مولانا محمد علی جوہرؒ! آپ نے ایسی حسین موت کو گلے لگا کر قوم کی عزت رکھ لی ہے۔ اور آپ کے جذبہ سرفروشی سے ہماری رجعت قہقہری کی سیاہیاں دھل گئی ہیں اس لیے آج ہر ایک غیرتمند مسلمان کے آئینہ دل میں شہید علم الدین کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔

۱۳۔ مولانا ظفر علی خان رح ! شہید علم الدین کے خون کی حدت سے غیرت وحمیت کے وہ چراغ روشن ہوئے ہیں۔ جنہیں مخالف ہوا کے تند وتیز جھونکے بھی بجھا نہیں سکتے۔ آپ کی شہادت سے قوم کو ایک نئی زندگی مل گئی ہے۔ وہ زندگی جسے اب موت بھی مار نہیں سکے گی۔

۱۴۔ میاں معراج دین صاحب ! شہید علم الدین غازی کی نسبت نے ہماری زندگیاں بھی فسانہ بنا دیں ورنہ اس قابل نہیں تھے کہ کوئی ہمیں پوچھتا۔ بس ہم تو اپنے محسن دوست کو خاموشی کی زبان سے دعائیں دیتے ہیں

۱۵۔ سید افتخار احمد خارئی ! ان لوگوں کی شوخی مقدر بھی مسلم ہے۔ جو اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں مگر یہاں بات ہی اور ہے۔ شہید علم الدین پر تو خود شہادت بھی ناز کرتی ہے۔

۱۶۔ حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری ! دولت کا لالچ کیا ہے نہ میرے دل میں کبھی حکومت کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں کسی دنیاوی حاکم سے آج تک مرعوب بھی نہیں ہوا۔ حمد ونعت کی رفتگی میں میری تار نفس بجتی رہتی ہے۔ میں نے کسی سے آگے بڑھ جانے کے متعلق بھی نہیں سوچا حسد کی آگ سے خدائے قدوس نے مجھے ہمیشہ محفوظ رکھا ہے۔ مگر غازی علم الدین شہید کا حال دیکھ کر میرے دل میں اس آرزو نے انگڑائی لی۔ کاش ! یہ موت مجھے نصیب ہوتی۔

۱۷۔ صاحبزادہ عبدالاحد صاحب نقشبندی ! جناب غازی علم دین شہید بل احیاء کا صحیح مصداق ہیں۔

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر ؎
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

۱۸۔ سید احمد شاہ صاحب ! مجھے تکبر کی حد تک ناز ہے۔ کہ میں میانوالی جیل کے عملے میں سے غازی علم الدین کے زیادہ قریب رہا ہوں۔ شہید کی زیارت سے جو کیفیت حاصل ہوئی ہے۔ وہ مجھے کتابوں کے پڑھنے اور واعظوں کے سننے سے نہیں ملی۔

۱۹۔ حاجی میاں نیاز احمد ایم اے ! غازی علم الدین شہید میرے قریبی حلقے میں سے تھے بچپن کے یادگار دن بھی قریباً ہم نے اکٹھے ہی گزارے۔ مگر اب وہ کہاں ہیں ! میں بلحاظ ادب کچھ کہہ نہیں سکتا اور چپ رہنا بھی محال ہے۔ البتہ خیالات پریشاں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ تصور ان کے نقش پا تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔

۲۰۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب ؒ ! غازی علم الدین شہید کی فضیلت قید حروف میں اسیر نہیں ہوسکتی۔ میں نے ہر موضوع پر خطابت کے جوہر لٹائے ہیں۔ مگر ان کے حال مطابق کچھ کہنے سے عاجز ہوں۔ میں توسن فکر و عقل دوڑاتے کے بجائے اس آیت کی تلاوت کیا کرتا ہوں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ

۲۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد ! میں شخصیت پرستی کا بہت بڑا مخالف ہوں۔ شرف و وقار کو میں کسی خاندان کی وراثت نہیں سمجھتا۔ اپنے اپنے کردار و عمل کے لحاظ سے اچھا اچھا ہے اور برا برا ہے مگر اس کے باوجود میرا جی چاہتا ہے کہ غازی علم الدین شہید کے لواحقین کا بھی احترام کروں۔

۲۲۔ کلیم اللہ ملک ! عشق کی جس رہگذر پر حضرت علم الدین غازی جادہ پیما ہوئے اس میں منزل مقصود نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتی۔ وہ ایسی موت مرے کہ مر کر زندہ ہو گئے۔ جو زندگی انہیں حاصل ہوئی۔ وہ تاابد قائم رہے گی۔ اس سارے فلسفے کا راز یہ ہے۔

میں تو کچھ بھی نہیں ہوں سیماب مگر
بات میری میرے سرکار ؐ بنا لیتے ہیں

۲۳۔ صاحبزادہ درویش فرید صابری ! غازی علم الدین شہید ہمارے تخیل کی پرواز سے فزوں تر ہیں۔ از روئے شریعت شہید کفن کا محتاج نہیں اس لئے مقام شہادت کی بلندی بھی قوت اظہار کی پنہائیوں میں نہیں سما سکتی۔

۲۴۔ قبلہ یار محمدؒ بہاولپوری ! جناب علم الدین شہید خوش قسمت ہیں۔ جو حرمت رسول ؐ پر قربان ہوئے۔ اگر ملاقات کا شرف حاصل ہوتا تو میں آپ کے قدم چومتا۔ اب تسکین تمنا کے لئے مرقد منور پر حاضر ہوں گا۔

۲۵۔ خاں محمد اکبر خاں ! غازی علم الدین شہید حیات مسلم کی زندہ علامت ہیں۔ انہوں نے فلسفۂ ایمان کی تشریح اپنے خون کے قطروں سے وقت کی پیشانی پر رقم کی۔ آپ کے ساتھ ربط و تعلق سے میرے دل کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ میری دعا ہے کہ خالق کائنات امت مسلمہ کے دلوں کو شہید مرحوم کے سوز دروں سے زندہ و آباد کر دے۔

پورے برصغیر اور خصوصاً پنجاب میں غازی علم الدین شہید کو جو شہرت دوام ملی ہے۔ وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ اگر وہ تختہ دار کی زینت نہ بنتے تو انہیں یہ بلند رتبہ ہرگز نہ ملتا۔ کہ شہادت کے دن سے آج تک وہ ہمارے دل کی دھڑکنوں میں مکین ہیں۔ ان کا نام سنتے ہی ہم مدہوش سے ہو جاتے ہیں۔ اور روح کی پیاس بجھ جاتی ہے لطف کی بات یہ ہے غازی علم الدین شہید کا نام شہروں سے زیادہ دیہات میں سنا جاتا ہے وہ اپنے خاص انداز میں شہید کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ آپ کا نام نامی آج بھی لوک گیت، ماہیے اور ڈھولوں کی جان ہے یہی وجہ ہے دیہات کا بچہ بچہ اپنے شہید کے نام سے مانوس ہے ان کے دل آپ کی محبت میں سرشار اور آنکھیں عقیدت سے لبریز رہتی ہیں۔

نوری کموکا اور دیگر سینکڑوں دیہاتی شعراء کے نام دیہاتیوں کے دل پر آج بھی نقش ہیں گو ڈھولے کی صنف تاریخی حقائق سے مکمل تعاون نہیں رکھتی مگر عقیدت میں ڈوبی ہوئی اس آواز کا انداز ایسا پیارا ہوتا ہے۔ کہ تصور کی آنکھیں وہ سب کچھ سرتاپا ظاہر دیکھ لیتی ہیں۔ دیہاتی نوجوانوں کو علم الدین شہید سے جو والہانہ عقیدت ہے۔ شہر کے پڑھے لکھے ہزاروں افراد اس شرف سے محروم ہیں۔ آج بھی گاؤں گاؤں اور گھر گھر میں روز و شب شہید رسالت کی باتیں ہوتی رہتی ہیں راقم الحروف کی کاوش کے اسباب بھی کچھ یہی ہیں۔

غازی علم الدین شہید کے متعلق پنجابی اور اردو میں چھوٹے چھوٹے درجنوں رسالے شائع ہوئے مگر وہ حالات کی گردش اور ماحول کے بھیانک پن سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ ۱۵ نومبر ۱۹۲۹ء کو اعوان بک ڈپو اردو بازار لاہور سے غازی علم الدین اور قاضی عبدالرشید شہید کی تصویروں کا ایک پمفلٹ شائع ہوا۔ جو تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکا، ۱۹۳۰ء کے آغاز میں پیر ابوالافضل غلام دستگیر نامی حاکمی نے اخبارات میں اس متعلق شائع شدہ مضامین کو یکجا کر کے غازی علم الدین شہید کی سوانح عمری مرتب کی۔ جس پر منگواتے کا پتہ منشی عزیز الدین نجم الدین تاجران کتب لاہو بازار کشمیری لکھا ہے۔ اسی دوران جناب محمد اسلم چشتی صاحب نے "پروانہ محمدؐ" کے نام سے ایک مختصر رسالہ شائع کیا۔ راقم الحروف نے بعض جگہ پڑھا ہے کہ مولوی ظہیری صاحب نے بھی غازی موصوف کے متعلق کچھ قلمبند کیا۔ ۱۹۷۰ء میں میاں محمد ابوالفتح ایڈوکیٹ نے "غازی علم الدین شہید" ایک پمفلٹ

لکھا۔ جو مکتبہ میری لائبریری لاہور نمبر ۲ سے شائع ہوا۔ میاں مذکور کی تصنیف کا ماخذ پیر غلام دستگیر نامی کا مرتب کردہ رسالہ ہے۔ اس میں مصنف نے کوئی تحقیقی اضافہ نہیں کیا۔ چونکہ وہ رسالہ نایاب تھا اس لئے میاں صاحب نے حسب ضرورت تحریف کر کے من و عن اسے نقل کر لیا اور یوں وہ صاحب کتاب بن گئے۔

پنجابی ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے اس کتاب میں صرف حوالہ جات کے ذریعے ہی خدمات پیش کی جا سکتی ہیں مندرجہ بالا تصانیف بھی ان کے لئے مفید ثابت ہوں گی پنجابی میں ایک قصہ نما رسالہ فیروز نامی شاعر نے لکھا۔ جو صرف آٹھ صفحات پر مشتمل ہے جس کی اشاعت امرتسر میں روز بازار سے ہوئی۔ یہ نمونہ پارہ پنجاب پبلک لائبریری کے شعبہ اردو میں آج بھی موجود ہے۔ واقعہ شہادت کے چند ماہ بعد ہی چوہدری فضل کریم سند صوتے بھی منظوم سوانح عمری غازی علم الدین شہید پر زور قلم صرف کیا۔ یہ منظوم کتاب ایک مدت تک ملک بشیر احمد تاجر کتب کشمیری بازار لاہور کے ادارے سے دستیاب تھی۔ پنجابی کے مشہور شاعر استاد اللہ لوک (معراجدین) بازار حکیماں، اندرون بھاٹی دروازہ لاہور کا ایک دیوان عاشق رسولؐ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جو انہوں نے غازی موصوف کی سوانح عمری کی نذر کیا اس کا سراغ بمشکل ملا ہے۔ اس کا ایک نسخہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور میں تا حال محفوظ ہے پروفیسر شہباز ملک صاحب نے اپنی تصنیف ووم آزادی دے مجاہد لکھاری، میں استاد عشق لہر کی ایک رباعی اور محمد رفیع اختر لاہوری کی نظم بھی نقل کی ہے ان کے علاوہ بھی درجنوں چھوٹی چھوٹی کتابیں اس کے متعلق لکھی گئیں۔ جو اب قریب قریب نایاب ہیں۔ باوجودیکہ میرا ذریعہ اظہار پنجابی نہیں۔ مگر کچھ لکھے بغیر چارہ کار ہی کیا ہے۔ اس کلام کے محاسن مجبور کرتے ہیں کہ عقیدت و محبت کے اس لہجے کو شامل کتاب کر دیا جائے۔ تاکہ الفاظ کے یہ حسین موتی ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیں۔ میاں معراجدین سے روایت ہے زیر نظر رباعی استاد عشق لہر نے بوقت جنازہ ڈاکٹر اقبال کی فرمائش پر سنائی اور ڈاکٹر صاحب نے وفور جذبات میں شاعر مذکور کی پیشانی چوم لی۔

میاں اج دو رنگیاں ویکھیاں نیں نالے غم سانوں نالے عید وی اے
علم الدین دی ایس بہادری دی سانوں دید وی اے تے شنید وی اے

جنت وچہ رضواناں نے پچھا نیئں کول خط او ہدے۔ تے رسید بھی اے
عشق آہر محمدؐ دا اوہ عاشق غازی مرد بھی اے تے شہید بھی اے

میاں معراجدین غازی علم الدین شہید کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے ہیں ایک فلم کمپنی نے شہید موصوف کے متعلق بنائی جانے والی فلم میں ان سے اشعار مانگے تھے اور ایک پارٹ بھی ادا کرنے کو کہا۔ مگر آپ نے ان کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ جب یہی حسرت لئے میں حاضر ہوا تو انہوں نے ازراہِ الفت و شفقت اپنے اشعار لکھوا دیئے یہ بات بھی توجہ کی طالب ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا مطلقاً نہیں جانتے۔

نہیں پیتی تے پی کے ویکھ وحدت وچ پیتی نیئں

عاشق رب دے پیندے آئے ۔ اوچے اونہاں رتبے پائے
ہر اک نوں اوہ کہندے آئے ۔ وحدت وچ پینی نیئں،
سرمد پی کے سیس کٹا یا ۔ شاہ شمس نے پوشش لوایا
شاہ منصور چڑھ گیا سولی ۔ کون کہندا اوس پیتی نیئں
پی کے ویکھ جے پیتی نیئں وحدت وچ پیتی نیئں

اک نے آرے ہیٹھاں پیتی ۔ اک تے مچھی دے پیٹ وچ پیتی
اک نے ونڈ کڈھا کے پیتی ۔ گھٹ کسے نے کیتی نیئں،
پی کے ویکھ جے پیتی نیئں وحدت وچ پیتی نیئں

علم الدین غازی انوکھی پیتی ۔ کارا نہیں مرداں والی کیتی
رسا چم کے گل وچ پایا ۔ منت کسے دی کیتی نیئں
پی کے ویکھ جے پیتی نیئں وحدت وچ پیتی نیئں

خنجر ہیٹھ حسینؓ نے پیتی ۔ زیارت پھر محبوب دی کیتی
بھاویں جام شہادت پیتا ۔ بیعت یزید دی کیتی نہیں
پی کے ویکھ جے پیتی نیئں وحدت وچ پیتی نیئں
بلھے شاہ نے گھوٹ کے پیتی ۔ اوہنوں چڑھ گئی بہتی مستی

کیتی کتری کھوہ وِچ پئے گئی
وڑھیا جدوں، میتھی نیئس ،
پی کے ویکھ جے پیتی نیئس وحدت وِچ پلیتی نیئس

اندروں باہروں خالی ہو یا
شاہ عنایت دے اگے رو یا
شاہ عنایت نے سینے لایا
کسر کوئی رہن دیتی نیئس
پی کے ویکھ جے پیتی نیئس وحدت وِچ پلیتی نیئس

وحدت والی پینڈے جھیڑے
ربدے ہو کے رہندے نیڑے
معراج ہیں وساں کیہڑے کیہڑے
گل رمز دی کیتی نیئس ،
پی کے دیکھ جے پیتی نیئس وحدت وِچ پلیتی نیئس

مولانا ظفر علی خاں نے بھی غازی علم الدین شہید کے حال مطابق چند اشعار لکھے تھے مگر شومئی قسمت کہ وہ دستیاب نہیں ہو سکے ۔ لبعض اصحاب کا اردو فارسی کلام جو مجھے مل سکا ہے ۔ دعوت مطالعہ دے رہا ہے

۱ —— مولانا ابوظفر نازش رضوی

السلام اے جانثار عزتِ اسلامیاں
رحمتت بادا اے فدائے ملتِ اسلامیاں

دشمن ناموس را از لبسکہ بیجاں کردہ
بہر دین حق عجب کار نمایاں کردہ

از جمال و نور ایزد سینہ ات پر نور بود
یعنے از عشق محمدؐ قلب تو معمور بود

گفتہ بے زاد ، تا منزل رسیدن مشکل است
عاشقی سہل است آرے غم کشیدن مشکل است

طرفہ ، راہے در دلِ مسلم تو پیدا کردہ
بازہ تازہ قصہ دار و رسن را کردہ

بورِ طالع مند بودی وچہ عزت یافتی
اے خوشا قسمت کہ سرداری جنت یافتی

اے شہید اے قدیۂ شاہ حجازی زندہ باد
نام تو تا حشر علم الدین غازی زندہ باد

۲ ـــــ منشی حفیظ اللہ اسلامی صاحب

الوداع اے فدیہ دینِ محمدؐ الوداع ۔۔۔ الوداع اے عاشق و شیدائے احمد الوداع
الوداع اے قابلِ تحسینِ بے حد الوداع ۔۔۔ الوداع اے ثانیِ منصور و سرمد الوداع
الوداع اے ساکنِ گلزارِ جنت الوداع ۔۔۔ الوداع اے بلبلِ باغِ رسالت الوداع
مرحبا اے راحتِ جان و دلِ اہلِ یقین ۔۔۔ حبذا اے جانثارِ سرورِ دنیا و دین
بر تو اے مردِ مجاہد آفرین صد آفرین ۔۔۔ رحمت باد اے منور قلب اے روشن جبین
تیرے دم سے آج رونق دیں کے بازاروں میں ہے ۔۔۔ کل تیرا سر دار پر تھا آج سرداروں میں ہے
دشمنِ ناموس کو تو نے وہ پہنچائی ہے زک ۔۔۔ ہوگیا مشہور تیرا کارنامہ دور تک
شورِ تحسین کا مچا ہے آج بالائے فلک ۔۔۔ تیری ہمت کے ترانے گا رہے ہیں سب ملک
اس قدر پاس تھا تجھ کو عزتِ اسلام کا ۔۔۔ خود مرقع بن گیا تو غیرتِ اسلام کا

۳ ـــــ خان اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی

میں رسن کو چوم لیتا ہوں تڑپ کر دار پر ۔۔۔ یا پلا دیتا ہے کوئی جام کوثر دار پر
یہ غلامانِ محمدؐ کی پرانی ریت ہے ۔۔۔ کودتے ہیں آگ میں چڑھتے ہیں اکثر دار پر
طور پر موسیٰ کو پیہم آرہی ہے یہ ندا ۔۔۔ اہلِ دل معراج پا لیتے ہیں چڑھ کر دار پر
یا تہِ شمشیر آتا ہے نظر اعجازِ عشق ۔۔۔ یا کھلا کرتے ہیں جانبازوں کے جوہر دار پر
کسقدر ہے تیرے عاشق کو شہادت کی خوشی ۔۔۔ کسقدر مسرور ہے اللہ اکبر دار پر

کھینچتا ہے کیوں مجھے محبوب کی آغوش سے
اور رہنے دے مجھے جلاد دم بھر دار پر

۴ ـــــ پیر غلام دستگیر نامی

عاشقِ جانباز احمد داد جاں مردانہ وار ۔۔۔ خویشتن را سوخت بر شمعِ وفا پروانہ وار
بر سرِ دار آمد سردار شد حلاج وار ۔۔۔ یافت تشریف و سلام و رحمتِ پروردگار
در جوانی جانِ شیریں باخت در عشقِ نبی ۔۔۔ زندہ جاوید شد آں خوش نصیبے سرمدی

ہاتفِ غیبی بسالِ فوتِ آں فخرِ محول
گفت، با روحِ قدس پروانہ شمعِ رسول
۱۳۴۸ھ

۵ —— سید ذوالفقار علی نسیم صاحب

بہ جنگ عشق علم الدین چوں کامل عیار آمد
حریف جام رنگیں شہادت شد بہ دار آمد

بہ قربانگاہ ناموس محمدؐ سر بکف گشتہ
سپہ تکبیر پر بسم گرد بلا مردانہ وار آمد

صدائے قدسیاں برخاست از خمخانہ اُلاّ
کہ سرشار مئے لا آسوئے حق مستانہ وار آمد

ترنم ریز شد ہر طائر قدسی بہ تہنیت
بہ نزہت گاہ فردوس بریں با جوش بہار آمد

ادائے حوریاں بر لغزش مستانہ اش قرباں
کہ از عشق محمدؐ مست گشت پرخمار آمد

خوشا صاحب مے کز ذوق بیتابی عشق او
دل اغیار خوں شد و مرحبا مسلم را قرار آمد

نظارہ کرد چشم او جمال نازنین حق،
چو دست مرگ چشم او آئینہ دار آمد

خدا رحمت کند آں سرخوش صہبائے الفت را
کہ در چشم حیاتش مرگ رنگیں خوشگوار آمد

۶ —— حضرت فوق دہلوی

کس لیے لاہور رشکِ ماہِ انور بن گیا
ذرہ ذرہ اس زمیں کا مہر و اختر بن گیا

اس زمینِ پاک میں مدفون ہے وہ سرفروش
شانِ احمدؐ میں تھا لفظِ غیر جس کو بارِ گوش

یہ مزارِ پاک خوابِ عشق کی تعبیر ہے
آشکارا اس خاک سے صداقت کی تفسیر ہے

یہ وہ بلبل ہے کہ قرباں جس پہ گلشن صد ہزار
یہ وہ پروانہ ہے جس پہ لاکھ پروانے نثار

آہ! وہ مستِ مئے ناب خمستانِ حجاز
رہبرِ راہِ حقیقت قاطعِ راہِ مجاز

عشقِ لیلیٰ، جوشِ وحشت قیس صحرائی میں دیکھ
جذبِ علم الدیں دل میں دل کی گہرائی میں دیکھ

نور بیں کر چشم باطن میں یہ رہتا ہے مکیں
چشمِ ظاہر میں سما سکتے یہ وہ جلوہ نہیں

فخرِ ہندوستاں کہ ہر لیے شیدائی ہے
[illegible]

السلام اے عاشقِ شمعِ حرم صد السلام
السلام اسلام کے تابندہ گوہر السلام

۷ ـــــ عبدالرحمٰن خاں قنبر لدھیانوی

اے غلامِ شہِ ابرار و رسولِ مدنی
مرحبا صلِّ علیٰ عاشقِ دینِ مدنی

جادۂ حق پہ مبارک ہو تیری گامزنی
مرحبا عشقِ محمدؐ میں تو قسمت کے دھنی

باعثِ فخر و مباہات ہے اے علم الدینؒ
قاطعِ کفر تیری ذات ہے اے علم الدین

کفر لرزاں ہے تیرے نام سے اے علم الدین
صاف ظاہر ہے تیرے کام سے اے علم الدین
کھل گیا صاف کہ اللہ کا محبوب ہے تو
سر فدا تو نے ہے نامِ شہِ ابرار کیا

حق ہے مسرور تیرے نام سے اے علم الدین
تھی محبت تجھے اسلام سے اے علم الدین
دل سے اس ملت کو مرغوب ہے تو
مرحبا صلِّ علیٰ تو نے عجب کار کیا

آج ہر دل میں ہے بس عزت و عظمت تیری
ساری دنیا پہ شرف لے گئی قسمت تیری

۸ ـــــ ابوالظفر مولانا سید امام علی شاہ نازش رضوی

مرحبا مرحبا اے عاشقِ دینِ احمدؐ !
جان پر کھیل گیا حرمتِ احمدؐ کے لئے
خلد میں کھولے ہیں تیرے لئے حوریں آغوش
مرگ سے اپنی ہراساں نہ ہوا جیتے جی
غیرتِ عشقِ نبی سے متاثر ہو کر
خلد میں کہتی ہے یہ غازیِ مغفور کی روح

آج تو دارِ شہادت پہ سرفراز ہوا
نہ دیا ہاتھ سے پر رشتۂ شاہِ شہدا
لیتے ہیں نام ملائک بصد آداب تیرا
زہے جرأت تیری اے فدیۂ محبوبِ خدا
دشمنِ دیں کا دیا نام زمانے سے مٹا
میرے حصے میں آئی ہے سعادت بخدا

للہ الحمد کہ مردیم و رسیدیم بہ دوست
آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ ما

۹ ـــــ منشی محمد صدیق صاحب صدیق دہلوی

جان دے کر ہو گیا ناموسِ احمدؐ پر نثار
مرحبا ہمت پہ تیری اے بہادر علم الدین

ہمت عالی نے تیرا نام روشن کر دیا
تو جہاں میں دوستدارِ اہلِ حق تھا بالیقین
واصلِ حق ہو گیا تو جان نثارِ مصطفےٰ
جنت الفردوس میں جا کر ہوا ہے تو مکین
نورِ ایماں سے کیا ہستی کو اپنی ضو فشاں
جان دے کر شمعِ باطل کو کیا دنیا سے گل
رحمتِ غفار بھی تیری معاون ہو گئی
کوثر و تسنیم کے باشوق پی تو جامِ مُل
تیری رحمت کے سنوں پر غور کی صدیق نے
جمع کرے پہلے دونوں سن کے قواعد و کل
عیسوی و ہجریہ سے توڑ پھر دل کفر کا
رونقِ خلد بریں شد عاشقِ ختمِ رسل

۱۰ ـــــ نامعلوم

عاشقِ جانباز را چوں عشق بردار کشید
بر استقبالش روحش طائرِ سدرہ رسید
آں جواں در جنت الفردوس چو بنہاد گام
گفت رضواں مرحبا صد بار یا غازی شہید

۱۱ ـــــ علامہ حضرت محمد اقبالؒ

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر!
ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر!
آہ! اے مردِ مسلماں، تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھاً آخَر!

۱۲ ـــــ مولانا ابو الاقبال علامہ عیش فیروزپوری

تجھے معراجِ عشقِ شاہ، سولی پر مبارک ہو
تجھے اوجِ سعادت کا یہ تاجِ سر مبارک ہو
تری طبعِ جواں تھی ہمنوائے حضرتِ خالد
تیری تیغِ ہلالی کو "سرِ کافر"، مبارک ہو
بر آئی ہے تمنا تشنۂ دیدار آنکھوں کی
مبارک تجھ کو وصلِ ساقیٔ کوثر مبارک ہو
مبارک حرمتِ شاہِ دو عالم پر فدا ہونا
رسن کا چومنا تجھ کو جواں ہو کر مبارک ہو
جہانِ عشق میں سردار ہونا دے کے سر اپنا
مبارک تجھ کو قربِ ختمِ پیغمبر مبارک ہو

۱۳ —— زہیر

ہزاروں آفریں لاکھوں ستائش ہوں تجھے ۔۔۔ تو عشق سرورِ عالمؐ میں لے گیا بازی

کیے جو اہلِ بڑوں نے وہ کام تو نے کیا ۔۔۔ نہ کیوں ہو خلد بریں میں تیری سرفرازی

سر اپنا اونچا کیا تیری سرفروشی نے ۔۔۔ دلوں میں شمع شہادت ہی تیری جانبازی

ہیں تر زباں تیری مدحت سرا ہیں مسلم دہر ۔۔۔ عراقی و رومی و چینی کہ ہندی و تازی

عجب نہیں کہ تیری روح لینے آئے ہوں ۔۔۔ جو بے کے فوجِ ملک بو حنیفہ و رازی

ہے تیرا باپ بھی کیا خوش نصیب طالع مند ۔۔۔ دیا ہے نذر، محمدؐ کو نوجوان غازی

سن شہید محبت بھی یادگار ہے ۔۔۔ ہجری عیسوی سال شہادت و غازی

سرِ ادب سے سنایا ہے قدسیوں نے زہیر ۔۔۔ زہے تقاضۂ قسمت شہید ہو غازی

۱۹۲۹ء ۔۔۔ ۱۳۴۸ھ

۱۴ —— خان صابر خلیلی امرتسری

زندگی مسلم کی کیا ہے؟ اہتمام حفظ دیں ۔۔۔ دین کیا ہے؟ خاتمِ آفاق کا زیبا نگیں

آفریں صد آفریں

جسم ہے "خیر الامم" لاریب اور اسلام جان ۔۔۔ قدر کیا تن کی جہاں میں جاں اگر تن میں نہیں

آفریں صد آفریں

یہ حقیقت کر دکھائی تو نے "علم الدین میاں" ۔۔۔ زندگی تیری تھی ناموس محمدؐ کی امیں

آفریں صد آفریں

کب گوارا تھی تجھے اک لحظہ توہینِ رسولؐ ۔۔۔ برق تھی شاتم کے حق میں تیری آہ آتشیں

آفریں صد آفریں

تھامنے سے تھم نہ سکتا تھا ترا سیلابِ عشق ۔۔۔ تھی تیری ہر موجِ خوں اک موج دریائے یقیں

آفریں صد آفریں

تیری جرأت نے توڑیں شرا چپالی "نخوتیں" ۔۔۔ پائے حق پہ سرنگوں رہتی ہے باطل کی جبیں

آفریں صد آفریں

پیکرت را گرچہ در ظاہر بہ دار آویختند | در حقیقت تیری روح پاک ہے طوبیٰ نشیں

آفریں صد آفریں

شہ رگ تو قطرۂ خونِ شہادت راکہ ریخت | وہ ہوا شانِ کریمی سے گل خلد بریں

آفریں صد آفریں

نقشِ ایمانی کو ہے سیل حوادث سیل عشق | یاں خطِ جام مئے گلرنگ ہے از رنگ چیں

آفریں صد آفریں

تیرے اندازِ شہادت نے یہ ثابت کر دیا | عشق والے مر تو جاتے ہیں فنا ہوتے نہیں

آفریں صد آفریں

ذرہ ذرہ تیری تربت کا چراغِ طور ہے | شرقستان مہ د خورشید ہے یہ سرزمیں

آفریں صد آفریں

سطوت اسلام کب ہے دبنے والی کفر سے | خود ہے جب صابر مشیت حافظ ناموسِ دیں

آفریں صد آفریں

۱۵ —— محمد افضل ہاشمی صاحب لاہور

کسی نے جیل میں جاکر یہ علم الدین سے کہا | کہ سن کے موت کا فتویٰ بھی تو ملول نہیں
یہ سن کے بولا وہ جانباز مرد غیرت مند | سمجھ گیا ہوں میں تو عاشق رسول نہیں
نبیؐ عزیز نہ ہوں جان و مال سے جس کو | ہزار دعوئی ایماں کرے قبول نہیں
رسول پاکؐ کی حرمت پہ جان دے دینا | نہ ہوا اصول جو اپنا تو کچھ حصول نہیں

یہ حکم موت ہے میرے لئے پیام حیات
مئے بقا سے ہے لبریز میرا جام حیات

۱۶ —— نامعلوم

کسی نے جاکے علم الدین سے پوچھا | تو حکم قتل سن کر بھی ہے ہشاش
مقام ایسے پہ اب تیرا گذر ہے | جہاں ہوتا ہے شیروں کا جگر پاش

تجھے مرنے کا اپنے کیا نہیں غم — کہ آتا ہے نظر ہشاش بشاش
کہا اس مردِ غازی نے یہ سن کر — سنو! کرتا ہوں میں رازِ دلی فاش
مجھے ہے شوق دیدارِ محمدؐ — ہو دل کو خوف سے مرنے کے کیوں جاش
میں سنتا ہوں محمدؐ کہہ رہے ہیں — کہ علم الدین خوش آئی دخوش باش
یہ مژدہ سن کے سیروں بڑھ گیا خون — نظر آدیں میں کیوں غم گیس دطیاش
محمدؐ کو میری آنکھوں سے دیکھو — پڑے ہو کیوں جہاں میں مثلِ خفاش

۱۷ــــ قطعہ تاریخ شہادت حضرت غازی علم الدین (آثمؔ)

جنہوں نے دیا بوسہ دار و رسن کو — آثمؔ ایسے خاصانِ حق بھی ہیں ہم میں
محمدؐ کی عزت پہ جو مر مٹے ہیں — اور ان کے ہیں چرچے عرب اور عجم میں
شریک ان شہیدوں میں ہے علم الدین بھی — اسے دیکھ لو آج باغ ارم میں

۱۸ــــ مصوّر

ناز کر اپنے مقدر پر شہید راہ عشق — آج تو آرائش بزم جہان نور سے ہے
خاکیان ہند سے اتنا ہی بالاتر ہے تو — جس قدر اس دوزخ صغریٰ سے جنت دور ہے
تیری جانبازی سے زندہ ہو گیا دین بلال — اے فدائے مصطفےٰؐ! تو رشکِ صد منصور ہے
زندہ ہیں کاغذ کی دنیا میں سلاطینِ جہاں — تذکروں میں بند ذکر قیصر و مغفور ہے
آشنا ہے بچہ بچہ قیس اور فرہاد سے — نام ہفت اقلیم میں عشاق کا مشہور ہے
تجھ کو دی عشق محمدؐ نے ادرحیاتِ سرمدی — گو کہ تیری موت سینوں کیلئے ناسور ہے
پھول برساتی ہے تجھ پر رحمت پروردگار — ہے نہیں اس میں ذرا بھی شک کہ تو مغفور ہے
پوچھتے ہیں جبرئیل امین بھی بار بار — مصطفےٰؐ کی گود میں کس کا سر رنجور ہے

آزادی کی بخشی علم الدین کو عشق نے
کے ہاتھوں مصوّر آہ ابھی مجبور ہے

۱۹ — ایک عاشقِ رسولؐ کی آرزو

ز مہجوری بر آمد جانِ عالم
ترحم یا نبیؐ اللہ ترحم

نہ آخر رحمۃ للعالمینے
ز محروماں چرا فارغ نشینی

ز خاک اے لالۂ سیراب برخیز
چو نرگس خواب چند از خواب برخیز

بروں آور سر از بردِ یمانی
کہ روئے تست صبحِ زندگانی

شبِ اندوہِ ما را روز گرداں
ز رویت روز ما فیروز گرداں

جہانے کردہ دیدہ فرشِ راہ اند
چو فرشِ اقبال پابوس تو خواہند

ز حجرہ پائے در صحنِ حرم نہ
بفرقِ خاکِ رہ بوساں قدم نہ

بدہ دستے ز پا افتادگاں را
بکن دلداریئے دلدادگاں را

اگرچہ غرقِ دریائے گناہیم
فتادہ خشک لب بر خاکِ راہیم

تو ابرِ رحمتی آں بہ کہ گاہے
کنی بر حالِ لب خشکاں نگاہے

دے دہ شمعِ افروزِ محبت
فگن در سینہ ام سوزِ محبت

دے دہ در طریقِ عشق پویاں
چو علم الدین دیدارِ تو جویاں

۲۰ — پیر غلام دستگیر نامی حاکمی

بجرمِ عشقِ محمدؐ اسیرِ علم الدین
چہ مہ بادج جبینِ منیرِ علم الدین

رسید مژدہ در رضوان چو شد رسن در گلو
کہ ہست خلدِ بریں ات میسرِ علم الدین

بگفت زود بدرگاہِ احمدؐم ببرید
کہ ہست کوئے محمدؐ مصیرِ علم الدین

رسید و گفت حبیبِ خدا السلام علیک
فدائے سرورِ دوراں فقیرِ علم الدین

مثالِ زید و خبیب اے بحرمتم قربان
شد بزمرۂ عشاق میرِ علم الدین

بدرجہ کہ رسیدی نصیبِ امت باد
شنوند مثلِ تو روشن ضمیرِ علم الدین

برائے سال وفاتش بگفت ہاتفِ غیب
شہیدِ عشقِ محمدؐ کبیرِ علم الدین ،

۲۱ — حسرت

وہ عشق جس نے ناتواں کو زورِ حیدری دیا
وہ عشق جس نے بے نوا کو تاجِ قیصری دیا

وہ عشق جس سے دل کو ایک لذتِ سکوں ملی
سکوں کے ساتھ ایک عجیب نعمت جنوں ملی

وہ کس کا عشق ہے! حبیب کبریا کا عشق ہے
وہ شاہ دوسرا کا عشق مصطفےٰ کا عشق ہے

اس عشق سے ہی علم دین محبوب مسلمین بنا
عشاق کے قلوب میں وہ دلنشیں مکیں بنا

کرچیاں

- گلدستہ افکار
- الفاظ بولتے ہیں
- قبلہؒ علی پوری نے فرمایا
- ڈاکٹر اقبالؒ کے حضور میں

○

خواب بن کے میری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

آزاد خیال طبقہ اسے دیوانہ یا مجنوں کہتا ہے تو کہا کرے، عشق جنون ہی تو ہے اور یہی جنون ہر سچے مسلمان کا سرمایہ حیات ہے۔ اسے جنون کہتے ہیں تو میری دعا ہے ملت مسلم کا فرد فرد مجنوں بن جائے اس جذبے کا نام اگر دیوانگی ہے۔ تو خدا کرے ساری قوم دیوانی ہو جائے۔

زندگی اور موت کے درمیان ذراسی مسافت ہے۔ گویا یہ رشتہ صرف اشارہ پلک سے قائم ہے آنکھوں کے دریچے وا ہوتے ہیں تو اذان دی جاتی ہے۔ جب وہ آخری معانقے میں محو ہو جائیں تو نماز کا وقت ہو جاتا ہے۔ جب تک آنکھوں کے چراغ جلتے رہیں صبح ہے۔ اور اگر بجھ جائیں تو زندگی کی شام، انسان اس غمکدے میں پہنچ کر روتا ہے اور لوگ خوشیاں مناتے ہیں۔ زندگی کا حاصل یہ ہے جب وہ سفر آخرت کے لئے کپڑے پہنے تو دنیا ماتم کرنے لگے۔ مگر اس کے ہونٹ تبسم کی آماجگاہ ہوں۔

چو نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

موت تو ایک اٹل حقیقت ہے بڑے بڑے نامور پنجہ قضا کی گرفت میں آئے۔ اس کی کمند ہر ایک کو بلا روک ٹوک دبوچ لیتی ہے ناوک اجل کے نشانے ہمیشہ بے خطا ہوتے ہیں اس کے آگے کوئی ڈھال کارآمد ثابت نہیں ہوتی۔ پیام اجل کے سامنے ہمہ صفت انسان بھی سرتاپا نیاز ہیں۔ مگر فرق یہ ہے بعض مر کر زندہ رہتے ہیں اور کچھ جی کر بھی مردہ ہوتے ہیں جو تسلیم و رضا کے خنجر سے ذبح ہو جائیں۔ ان تک پہنچنے سے پہلے موت خود مر جاتی ہے۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جان دیگر است

چشم فلک نے ہزار بار نظارہ کیا ہے کہ سرور کونین خواجہ کل جہاں حضرت محمد مصطفیٰ کا عشق انسان کو معراج کمال پر پہنچا دیتا ہے۔ حبش سے اٹھا کر حجاز میں لاتا ہے اور کبھی ایک ذرہ حقیر کو زریں خلعت پہنا دیتا ہے۔ لاہور کا ایک غیر معروف لڑکا علم الدین جسے محلے کے لوگ علما کہتے اور ۴ اپریل سے قبل اسے تعلق داروں کے سوا کوئی جانتا نہ تھا اس قدر عزت پا گیا، کہ واقعی علم الدین بن گیا اور علم بھی وہ نکتہ داں جہاں سر دھنتے ہیں اور فلسفیان زمانہ انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ اب اسے ہر ایک جانتا اور پہچانتا ہے کوئی اسے غازی کہہ کر پکارتا ہے بعض عاشق رسول نام رکھتے ہیں کوئی شہید کہتا ہے۔ کچھ پروانہ شمع رسالت کا خطاب دیتے ہیں ہر مسلمان کے دل میں اس کی عزت ہے۔ جس شہر میں جاؤ اس کا چرچا۔ جس گاؤں سے گزرو اسی کا ذکر ہے علم الدین کی اتنی شہرت کیوں ہوئی؟ علم الدین نے اتنا نام کیوں پایا؟ علم الدین

ایسا محبوب کیوں بنا؛ بس جذبہ عشق صادق ہے۔ خواجہ ہر دو سرا صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق سے ہی اس کی زندگی فسانہ بنی۔

تیری دوستی سے پہلے مجھے کون جانتا تھا
تیرے عشق نے بنایا میری زندگی فسانہ

میرا عقیدہ ہے علم الدین نے نجاری کا پیشہ سیکھا نہیں اسے سکھایا گیا اس لئے کہ ہاتھ نظر ٹکنے کے مقام پر ضرب لگانے میں مشاق ہو جائے۔ دراصل یہ ذریعہ معاش نہیں راجپال کی موت کا سامان تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں علم الدین نے اوچھے طریقے سے اپنا غصہ فرد کیا۔ شاید وہ نہیں جانتے کہ جس مسلمان کو حضور کی ذات کے ساتھ والہانہ لگاؤ نہیں۔ اس کا دعوٰی اسلام وایمان ناقابل قبول ہے۔ مسلمان کی شان یہ ہے میدان جنگ میں اس کا حریف اگر منہ پر تھوک دے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے دعوت مبارزت دیتے ہوئے کوئی کافر گالیاں بکے تو برداشت کیا جا سکتا ہے حالت نماز میں اگر کوئی دشمن اس کے جگر میں اپنا خنجر اتار دے تو وہ یہ وصیت کر سکتا ہے کہ جب تک میرے جسم میں جان باقی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہ کیا جائے۔ جسے انتقام پر محمول کیا جا سکے اور جب میری روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے تو قصاص لینے میں میرے وارث مجاز ہیں لیکن عشق رسولؐ اس کے قلب کا نازک ترین گوشہ ہے اس پر کوئی چرکا لگائے، تو عفو و درگذر سے رشتہ چھوٹ جاتا ہے اور پھر جو کچھ اس سے ہو سکے وہ نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر کر گزرتا ہے علم الدین مرحوم و مغفور نے جو کچھ کیا عشق رسولؐ کے جذبہ بے پناہ کے تحت کیا۔ آزاد خیال طبقہ اسے دیوانہ یا مجنوں کہتا ہے تو کہا کرے عشق جنون ہی تو ہے اور یہی جنون ہر سچے مسلمان کا سرمایہ حیات ہے اسے جنون کہتے ہیں تو میری دعا ہے ملت مسلم کا فرد فرد مجنوں بن جائے اسی جذبے کا نام اگر دیوانگی ہے۔ تو خدا کرے ساری قوم دیوانی ہو جائے۔

لوگ کہتے ہیں علم الدین ان پڑھ تھا۔ بعض کا خیال ہے وہ داڑھی منڈواتا تھا اس میں کلام نہیں۔ بلاشبہ علم الدین ناخواندہ اور آزاد منش تھا۔ لیکن قدرت نے جس ذوق بصیرت اور غیرت وحمیت سے اسے نوازا۔ اس پر ہزارہا مغزان علم نثار کئے جا سکتے ہیں

معترضین بیچارے کیا جانیں کہ عشق میں سندوں کو نہیں دیکھا جاتا۔ ذات پات کی پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔ حضرت بلالؓ کے پاس بھلا کونسی ڈگری تھی، اویس قرنیؓ نے کہاں سے ڈپلومہ حاصل کیا اور حضرت حارث و خبیبؓ کس یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوئے۔ عشق ڈگریوں کا نام نہیں، ایک جذبہ ہے۔ وہ جذبہ جو غازی علم الدین کے سینے میں موجزن تھا۔ اسی جذبے کے طفیل آج ہم ان سے نسبت غلامی رکھتے ہیں۔ اقبال مرحوم نے سچ کہا ہے "خدائے قدوس کچھ کام داڑھی والوں سے لیتا ہے اور کچھ داڑھی منڈوانے والوں سے۔ اس لئے کہ جب بخاری صاحب نے تقریر ارشاد فرمائی۔ جلسے میں ہزاروں افراد شامل تھے ان میں بڑے بڑے عالم تھے اور شب بیدار زاہد بھی۔ حتیٰ کہ سینکڑوں باریش بھی موجود تھے۔ مگر جو کام علم الدین نے کیا وہ کوئی اور نہ کر سکا" اس سے قطع نظر غازی علم الدین کم سن تھے۔ بوقت گرفتاری آپ کی عمر بیس سال چار ماہ اور دو دن تھی۔ جبکہ شہادت کے روز ان کی تسبیح روز و شب کا شمار بیس سال دس ماہ اور ستائیس یوم ہے تختہ دار پر چڑھنے تک صرف چند بال رخسار پر نکلے اور مونچھیں تو ابھی پھوٹی بھی نہ تھیں۔ پھر داڑھی ترشوانے کے کیا معنی! راقم الحروف کہہ دینا چاہتا ہے عطاء اللہ شاہ بخاری کے جلسے میں جتنے لوگ تھے آپ کو حرمت رسولؐ کا ان سب سے زیادہ پاس تھا اور عشق رسول کی تڑپ آپ کے دل میں لاہور کے تمام مسلمانوں سے زیادہ تھی۔

ہم نے اکابر صوفیا و اتقیا کے سفر آخرت کی کیفیتیں دیکھی اور سنی ہیں ان لوگوں کے جنازوں میں شامل ہوئے ہیں جن کی عمریں علوم دین کی خدمت میں صرف ہوئیں ہماری آنکھیں ان کی تجہیز و تکفین کے نظارے کر چکی ہیں جن کے روز و شب وعظ و تذکیر میں گزرے ہیں بادشاہوں اور سلطان کے جنازوں کا حال بھی معلوم ہے علم الدین شہید عالم دین تھا نہ واعظ کوئی مشہور یا غیر مشہور صوفی و متقی نہ تھا۔ گروہ یا کسی جماعت کا قائد نہ تھا۔ کسی ملک یا اس کے کسی حصے کا قلمدبھی نہ تھا۔ شاید وہ زائرین کے گروہ میں چند افراد کا شکل آشنا ہو مگر حرمت رسولؐ پر اس کی زندہ گواہی نے اسے وہ بلند مقام عطا کیا جو ان سینکڑوں سلاطین، ہزاروں اتقیا اور لاکھوں علماء کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ یہ مقام شہادت کی بلندی

ہے اور بلند منصب اسے کہتے ہیں سنا ہے اس مقام کے متعلق قبلہ علی پوری ؒ نے فرمایا "ہم نے بیت الحرم میں نمازیں ادا کیں۔ مسجد نبوی میں سجدہ ریزیوں کا لطف بھی اٹھایا۔ مگر جو کیفیت علم الدین کے جنازے میں شامل ہو کر ہوئی وہ مجھے کسی اور جگہ نہیں ملی۔ کیا عجیب ہے کہ خواجہ کل جہاں آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے غلام کے جنازے میں خود تشریف لائے ہوں۔ اور اغلباً میری اس کیفیت کا سبب بھی یہی تھا"

جہاں سرور میسر تھے جام و مے کے بغیر
وہ میکدے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں

اب بھی نت روز سینکڑوں جنازے اٹھتے ہیں۔ جدائی کے غم میں لواحقین صف ماتم بھی بچھاتے ہیں۔ مگر اب کے وہ ہیجان اور شوق و غم کا عالم کہاں نصیب بزم نشاط کے دور بھی آتے رہتے ہیں لیکن حاضرین چلتی پھرتی لاشیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس جنازے اور ان جنازوں کے مابین کتنا تضاد ہے وہ ایک دولہا کی برات تھی اور یہ مردوں کا ماتم۔ یہ جی کر بھی ننگ قوم ہیں اس نے مر کر بھی اپنے خون سے ہند کے در و دیوار پر کبھی نہ مٹنے والے یہ الفاظ لکھ دیئے۔ کہ یہ سرزمین حقیقی امن سے اس وقت تک ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس میں بسنے والے انسانیت کبریٰ کے اس سب سے بڑے ہمدرد اور فطرت انسانی کے اس سب سے بڑے رازدان کا ادب کرنا نہ سیکھیں۔

ناموس رسالت ؐ کی حفاظت فرض کفایہ ہے غازی علم الدین نے یہ فریضہ چکا دیا وہ قوم کے محسن اور فرزندان توحید ان کے قدردان ہیں اگر غازی علم الدین کفن بدوش جہاد نہ کرتے تو آج پستی کی عمیق کھائیاں ہمارا مقدر ٹھہرتیں۔ اور کل دربار رسالت ؐ کے کٹہرے میں ہم مجرم کی حیثیت سے کھڑے ہوتے۔ غازی صاحب نے جو کام کیا ہے اسے جرم اور قانون کی زبان میں آپ کو مجرم کہتے ہیں اس معاملے میں مجھے اردو کی تنگ دامنی کا بھی شدت سے احساس ہوا۔ جانے لوگ خوبصورت لفظ پر نقطے کا بوجھ کیوں بڑھا دیتے ہیں۔ میں ان رازدارانہ حروف سے نقطے کا وزن ہٹانا چاہتا ہوں تاکہ واضح ہو جائے آپ مجرم نہیں محرم ہیں۔ ایک روز میں آئینہ ماضی میں منعکس ایک تصویر دیکھ رہا تھا کہ میرا طائر فکر پرفشاں ہو کر صاحب تصویر کی تلاش میں اڑا اور اڑتے اڑتے کہیں

بہت دور نکل گیا۔ جنگل جنگل گھوما، شہر شہر ڈھونڈا، مگر اسے کہیں نشان منزل نہ ملا۔ آخر تھک ہار کر شاہی مسجد کے مشرقی جنوبی مینار پر جا بیٹھا۔ یہاں سے وہ آہستہ آہستہ اترا، اور اقبال مرحوم کی قبر پر چادر کے نیچے چھپ گیا پھر "سوئے قطاری کشم ناقۂ بے زمام را"، کا ورد کرتے ہوئے بولا مرشد من سائل بے نوا منزل کی تلاش میں پریشان خاطر ہے۔ اے آسودۂ خاک! مجھے اس کی خبر دینا۔ تھوڑی دیر بعد درمیان میں جو پردہ حائل تھا وہ اٹھ گیا اور روح اقبال نے غیرمرئی طور پر اپنے مرید کو یہ نکتہ سمجھا دیا کہ شہید رسالت کے دو ہی ٹھکانے ہیں۔ مومن کا دل اور ایک بارگاہ رسالت مومن کا دل آئینہ ہے۔ جس میں ایک شہر آباد ہے وہی شہر درحقیقت مدینہ ہے۔ اور مدینہ میں رسول عربیؐ کا بسیرا ہے یقیناً علم الدین بھی وہیں موجود ہوگا اور جن کی نگاہیں نظارے کی تاب رکھتی ہے وہ نور بصارت کے جوہر سے دربار رسول کا طواف کریں۔ پروانے شمع رسالت کے گرد حلقہ باندھے ہوں گے جبریل امین پوچھ رہے ہوں گے کہ محمدؐ کے قدموں میں یہ کس کا سر ہے۔ بلال حبشیؓ وہاں رونق افروز ہوں گے اور اویس قرنیؓ بھی۔ میر مجلس کے قدوم میمنت لزوم کو چوم کر ایک دیوانہ اپنے ہونٹوں کی پیاس بجھا رہا ہوگا۔ یہی غازی علم الدین شہید کا منصب ہے ابوبکرؓ و علیؓ بڑی شفقت سے اس کا منہ تک رہے ہوں گے۔ عمرؓ و عثمانؓ اور دیگر تمام اہل حضور کی نگاہیں ان دیکھنے والوں کے چہرے پر جمی ہوں گی

سب لوگ جدھر وہ ہیں ادھر دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

لوگ حیران ہوتے ہیں کہ علم الدین کو مرنے کا غم نہ ہوا۔ پیر دستگیر نامی بھی ابتداً اس سوچ میں مستغرق رہے۔ مثنوی شریف پڑھتے پڑھتے وفات بلالؓ کی حکایت سامنے آئی تو ان کی یہ حیرانی دور ہوگئی اور معلوم ہوگیا کہ عاشقان رسولؐ ہمیشہ خوشی سے جان دیا کرتے ہیں۔ حضرت بلالؓ کی بیوی آپ کے دم رحلت اظہار غم کرتی ہے اور بلال اظہار خوشی۔ بیوی کہتی ہے الفراق الفراق، بلالؓ کہتے ہیں الوصال الوصال۔ بیوی کہتی ہے کہ تم آج رات مسافر بن چلے۔ بلال کہتے ہیں نہیں میں داخل وطن ہوا بیوی کہتی ہے واحسرتا، بلالؓ کہتے ہیں وادولتا۔ بیوی کہتی ہے اب میں تمہارا چہرہ کہاں دیکھوں گی بلال جواب دیتے ہیں اللہ کی یاد میں خلوت نشین ہوکر۔ اے میری رفیق حیات! میں اس دنیا کے قید خانے میں بڑا تنگ تھا۔ اب مرکر رہا ہو جاؤں گا۔ تجھے کیا خبر کہ مرنے میں کیا مزا ہے۔ دنیاوی

چاہ خانہ میں مثل گدا پڑا تھا۔ اب بادشاہ بن گیا ہوں۔ مجھے رہنے کو محل درکار ہے۔ جو جان دینے سے ہی ملتا ہے تو نیند کی طرف دیکھ، جو موت کی مثال ہے کہ اس میں جان کس طرح غم و فکر سے چھوٹ جاتی ہے اور کس طرح تن کا قیدی جس کی فکر سے آزاد ہو جاتا ہے ایک عاشق بلال کا قصہ دوسرے عاشق علم الدین کے واقعہ سے کس قدر ملتا جلتا ہے عشق رسول میں دونوں یک زبان و یک خیال ہیں۔

میں کچھ دیر کے لئے ناظرین کے دماغ میں اپنے فکر کا گھروندا بنانا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ بھی میرے تخیل کے ساتھ پرواز کر سکیں دنیا جانتی ہے اقبال مرحوم کے مضراب فکر پر عشق رسول کے نغمے ناچتے تھے کہ اس نے خاک مدینہ و نجف کو اپنی آنکھ کا سرمہ بنایا ہے۔ غازی علم الدین شہید عاشق تھے اور اقبال بھی۔ تڑپ اور شدت کی چنگاریاں دونوں کے دل میں فروزاں تھیں جنس جنوں کو خرد کے ترازوے تولا نہیں جاتا۔ یوں بھی اہل عشق کا تقابلی جائزہ لگانا کم نظری کی علامت ہے مگر بازار عشق میں قائم رہنے والی شے سے اس کی قیمت کہیں زیادہ لگتی ہے جو ٹوٹ جائے۔ کیونکہ عشق عقل کے تابع رہے تو خوب اور عقل عشق سے مغلوب ہو تو خوب تر ہے شہید موصوف دست جنوں سے عقل کا گریبان پھاڑ کر اپنے رقیب اقبال سے بہت آگے نکل گئے خدا جانے اقبال مرحوم پر کبھی مکاشفہ کے دروازے کھلے بھی کہ نہ کھلے۔ شاید وہ عالم رؤیا میں بھی اپنے مولا کے دیدار سے مشرف ہوئے یا کہ نہیں۔ مگر شہید علم الدین نے تو ہر حال اور ہر رنگ میں شربت وصل کے پیالے پیئے ہیں۔

ایک عاشق کے قلم سے ٹپکے ہوئے چند قطرے دیکھ کر میری بھی رگ ذوق پھڑک اٹھی اور لاہور و میانوالی کے مابین مکالمہ قلمبند کرنے پر کمربستہ ہوا۔ بات یوں ہے کہ لاہور میں غازی علم الدین شہید کی تجہیز و تکفین کے بعد یہ نکتہ موضوع بحث بن گیا۔ کوئی کہتا میانوالی افضل ہے بعض لاہور کا نام لیتے۔ سینکڑوں ایسے تھے جو میانوالی کی سیاہ بختی کا رونا روتے اب یہی مقدمہ قارئین کے ضمیر کی کچہری میں پیش کیا جاتا ہے۔

لاہور۔ اے میانوالی تجھے معلوم ہے کہ اب تیری راہوں کو اس قدر وضاحت سے کیوں بیان کیا جاتا ہے صرف اس وجہ سے کہ ایک البیلے عاشق نے تیرے ہاں چند روز قیام کیا اور اس کے چاہنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ تو لاہور کو منہ دکھانے کے قابل نہیں کہ میں

نے اپنا جیتا جاگتا جگر گوشہ تیرے پاس بھیجا اور تو نے اسے سولی پر چڑھا کر اپنی دانست میں بے جان کر دیا۔

میانوالی! میں اپنی قسمت پر نازاں ہوں کہ میرا نام بھی یوسف کے خریداروں میں لیا جاتا رہے گا۔ میرے لئے یہ شرف سرمایہ افتخار ہے کہ وہ عاشق صادق جو تیرے ہاں جدائی کے دن گزار رہا تھا میں نے اسے یکلخت اس کے محبوب ﷺ کی زلفوں کے سائے میں سلا دیا علم الدین مجھ کو مبارک سمجھتا ہے کہ اسے میری آغوش میں درجہ شہادت نصیب ہوا۔

لاہور! اے میانوالی تو نے نہیں دیکھ لیا۔ جس کی ہستی تو نے مٹا دی وہ سراپا حیات بن گیا جس جسم کو تو نے شان شایان جگہ نہ دی وہ تجھ سے جدا ہو کر کس شان سے اپنے قدر شناس خطے میں پہنچ گیا۔

میانوالی! میرے دوست تو نے غلط سمجھا۔ میں نے اس کی ہستی مٹائی نہیں بلکہ عمر جاوداں عطا کی ہے میری خوش نصیبی پر رشک کیا کر۔ کہ اس ٹلی دولہا کی پر شکوہ برات کا اہتمام میرے پہلو میں ہوا۔ پھولوں کا پہلا سہرا بھی میرے ہی مکینوں نے پہنایا۔ شب وصال اور منہ دکھائی کی مبارک رسم بھی میرے ہی گھر میں ادا ہوئی۔

لاہور! تیرے دامن میں ہے ہی کیا۔ آ ذرا میرے پاس اور آسودگان خاک کو دیکھ یہ تیری بدقسمتی ہے کہ تیرے قابو میں ایک شہباز آیا۔ مگر تو اسے اپنی فطرت سے مانوس نہ کر سکا۔ اب اپنی بدنامی اور بدنصیبی کا ماتم کیا کر۔

میانوالی کے داغ دل دیکھنے کے بعد اب ذرا تاریخ مسلم کے صفحات پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ جہاں دو گروہوں کے تذکرے موجود ہیں۔ ایک سرمایۂ زیست کی ہر شے کو اسلام پر قربان کرتا ہے اور دوسرا اسلام کو ہر چیز کے عوض داؤ پر لگا دیتا ہے۔ اول الذکر فخر و انبساط کی دولت اور موخرالذکر ننگ ملت ہوتا ہے۔ خدا اور دنیا کے بندوں میں تمیز بالکل واضح ہے۔ دنیا والوں کی نسبت سے عشرت محل اور رقص گاہیں تعمیر ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس خاصان حق کے نقوش پر مسجدیں اور درس گاہیں بنتی ہیں۔ غازی علم الدین شہید کا جنازہ یونیورسٹی گراؤنڈ کے قریب پرانی چاند ماری (رائفل رینج) میں پڑھا گیا۔ جہاں شہید ناز کی چارپائی رکھی گئی۔ عین اس جگہ چوبرجی

پارک سے ملحقہ جامع مسجد المعروف جامعہ لال مسجد آباد ہے۔

اللہ رے جبین شوق کے سجدوں کی رفعتیں ؎
سر کو جہاں جھکا دیا، کعبہ بنا دیا۔

یوں تو سریانوالہ بازار کے سینے پر درجنوں شہرت یافتہ حضرات کے نشان قدم ثبت ہیں اس محلے کے علاوہ لاہور کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ پاکستان کے مشہور خطاط و مصور عبدالرحمٰن چغتائی، مولانا داؤد احمد غزنوی، یزدانی ملک اور مشہور ادیب عبداللہ ملک کا مولد و مسکن بھی یہی ہے۔ اقبال مرحوم کے قریبی رفیق کار ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر نذیر احمد اور پنجابی کے عظیم شاعر نیاز بھکھی کا ابتدائی تعلق بھی اسی بازار سے ہے۔ سیاست اخبار کے مدیر و مالک سید عنایت شاہ کا عارضی قیام بھی اسی محلے میں رہا۔ "مسلم آؤٹ لک" کے مالک مولانا عبدالحق اور پرنٹر و ناشر بھی اسی محلے میں رہتے تھے۔ پنجابی کے نامور شاعر ہدایت اللہ "ماہنامہ نرگس" کے ایڈیٹر مجید اکملی اور سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ مولوی نور احمد چشتی، حکم علی چشتی اور ابراہیم چشتی کا تکیہ بھی اسی جگہ ہے۔ لیکن اصل وجہ شہرت یہ ہے کہ اس کی رسول کریمؐ کے فدا کار غازی علم الدین شہید سے ایک خاص نسبت ٹھہری ہے۔ سریانوالہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے۔ کہ یہاں خصوصاً ذبیحہ بکروں کے سر اور پائے فروخت ہوتے ہیں۔ بعض لوگ اس بازار کو بازار علم الدین بھی کہتے ہیں۔ غازی علم الدین شہید اور آزادی کے بعض دیگر متوالوں کی رعایت سے ایک مدت سے اس کا نام محلہ سرفروشاں زبان زد خاص و عام ہے۔

اہل دل کے لئے یہ حکایت بھی بڑی کشش رکھتی ہے کہ تعارف کا ذریعہ والدین کی نسبت ہے۔ بصورت دیگر اپنے اچھے اور برے اوصاف سے پہچان ہو جاتی ہے مگر دور نزدیک کے تمام رشتے دار اپنا تعارف شہید موصوف کی نسبت سے کراتے ہیں کیا عجیب ہے کہ یہ کوشش میرے لئے بھی ذریعہ تعارف بن جائے۔

اُفقِ سیاست پر شہیدِ رسالت کے انمٹ نقوش

- اقبالؒ نے ایم اے جناح کو کیا لکھا ؟
- دو قومی نظریے کا پختہ اتفاق کیوں ہوا ؟
- پاکستان کی بنیاد میں کس کس کا لہو ہے ؟

؎ قیامت خیز ہے افسانۂ پُر درد و غم میرا
نہ کھلواؤ زباں میری ، نہ اٹھواؤ قلم میرا

میں تاریخ کے پریشان اوراق کے مطالعے میں گم تھا ہوئے
سے تفکر کی گہری جھیل میں تموج پیدا ہوا۔ میرے تھکے ہارے لہجے نے اس
کیفیت کا سبب پوچھا۔ تو تاریخ کے صفحات نے یہ سربستہ راز اگل دیا۔ کہ
تاریخ اسلام اور تاریخ مسلم خلافت راشدہ تک ایک ساتھ تھیں۔ جس
کے بعد وہ جدا جدا ہوگئیں۔

تاریخ کے گم گشتہ اوراق کی ترتیب وتدوین اہم فرض ہے اور وقت کا تقاضا بھی۔ ورنہ مستقبل قریب کے قارئین یہ عقدہ کیونکر وا کر سکیں گے۔ عقیدہ مسلم ہے اور ماضی کے نازک مرحلے بھی گواہ ہیں۔ اگر غیبی تائید شامل حال نہ ہوتی تو پاکستان شاعر کا خواب تھا۔ جو کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوتا۔ ایک موہوم امید تھی جس کا عملی دنیا سے کوئی تعلق واسطہ نہ تھا کیا پاکستان اس وقت کا بن چکا ہے جب پہلے مسلمان نے برصغیر میں قدم رکھا نہیں! یہ تو دو قومی نظریہ ہے مسلم قوم کے گرم لہو کا زندہ ثبوت اور ایک مرد جری کا ہوشربا فلسفہ ہے۔ قیام پاکستان کو سرسید کی تعلیمات کا ثمرہ کہنا تاریخ کا ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اسے انگریزوں کی سازش قرار دینا شہیدوں کے لہو کے ساتھ بھیانک مذاق ہے۔ البتہ آزادی کی بے بہا نعمت کو نواب سلیم اللہ خاں کی کوشش سمجھنا، یا سلطان ٹیپو کی شہادت سے منسوب کرنا، ایسا موقف ہے تاریخ جس کی تردید نہیں کرتی۔ قائداعظم بھی قوم کے عظیم محسن ہیں۔ وہ مسلم آزادی کے بہت بڑے نقیب تھے ان کی انتھک جدوجہد کا اعتراف ناگزیر ہے وہی اسلامی ریاست کی تشکیل کرنے کے حقیقی سزاوار ہیں۔ دانشور کہتے ہیں۔ منجمد خون کے لتھڑے اقبال کی آتش نوائی سے پگھل گئے اور اسلامی مملکت ان کے برق صفت سخن کی رہین منت ہے۔ اقبال قومی شاعر تھا اور انسانیت کا پاسبان بھی۔ ہم اس کے قدر دان ہیں اور وہ پاکستان کی عزت ہے۔ مگر تعمیر وطن کے معاملے میں میرا نظریہ قدرے برعکس ہے۔ میں تاریخ کے پریشان اوراق کے مطالعے میں گم تھا۔ ہولے سے تفکر کی گہری جھیل میں تموج پیدا ہوا۔ میرے تھکے ہارے لہجے نے اس کیفیت کا سبب پوچھا۔ تو تاریخ کے صفحات نے یہ سربستہ راز اگل دیا کہ تاریخ اسلام اور تاریخ مسلم خلافت راشدہ تک ایک ساتھ تھیں جس کے بعد وہ جدا جدا ہو گئیں واقعات کا تسلسل شاہد ہے۔ قاضی عبدالرشید کی شہادت سے دو قومی نظریے کی اہمیت اجاگر ہوئی۔ غازی علم الدین کی موت مسلمانان ہند کی زندگی کا آغاز ہے۔ شہید محمد رفیق کی استقامت سے انگریز حکومت کی بنیادیں متزلزل ہوئیں غازی عبدالقیوم شہید کے لہو سے اقبال مرحوم نے پاکستان کی تصویر میں رنگ بھرے اور شہید رسالت محمد عبداللہ کی ایمانی جرات اس واحد نظریاتی مملکت کی اساس ہے مگر افسوس ہم نے آزادی کے اصل پس منظر کو حوالہ غفلت کر رکھا ہے اس کے اسلامی محرک اور اسباب بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں میرا حاصل مطالعہ شاید قارئین کو عجیب سا لگے مگر آزادی

کی غیر مترقبہ نعمت کا حصول شہدائے رسالت کے طفیل ہے اور پاکستان ان کے قطرہ خون کا صلہ ہے

دمک رہا ہے شبستان مگر حساب کر

ہمارے خون سے کتنے دیئے جلائے گئے

اس باب کا آغاز وہ واقعہ ہے جب فدا کار رسالت کو سپرد خاک کرنے کے بعد اقبال نے عرض کیا "غازی علم الدین شہید! جب دربار رسالت میں پہنچنا تو آقا و مولا کی بارگاہ میں میرا سلام پیش کرنا اور اسلامی ممالک خصوصاً برصغیر کی سیاسی آزادی کے لئے دعا کرنا" آپ کی شہادت سے برصغیر کی فضائے سیاست پر دور رس انقلابی اثرات مرتب ہوئے۔ انقلاب نے ۱۹ نومبر ۱۹۲۹ء کو ایک اداریہ سپرد قلم کیا جس میں "علم الدین شہید کمیٹی" کی بہادری و جواں مردی کی تعریف کی گئی ملک لال دین قیصر اور ان کے رفقاء کی خدمات کو سراہا گیا۔ اس اداریے کا عنوان تھا "ملک لال دین قیصر سے خطاب، شہید علم الدین کی میت سے ایک اہم سبق" چنانچہ اداریے میں لکھا تھا "آج ہم انتہائی دلسوزی کے ساتھ قیصر اور ان کے رفقاء سے عرض کرتے ہیں۔ کہ وہ ملت اسلامیہ ہند کے زہرہ گداز مصائب پر بھی توجہ مبذول فرمائیں۔ مسلمان افتراق سے دو چار ہو چکے ہیں۔ فرقہ بندی میں اپنی حکومت کھو چکے ہیں ان کی مقدار کم نہیں۔ ان میں ہمت و جرأت کا فقدان نہیں۔ ان میں قربانیوں کا جوش و خروش موجود ہے مگر ان کی ساری قوتیں خانہ جنگی میں ضائع ہو رہی ہیں وقت نازک ہے حالات اضطراب انگیز ہیں۔ ہندو متحد ہیں اور قدم قدم پر فائدے اٹھا رہے ہیں۔ لیکن مسلمان متفرق و منتشر ہیں اور ہر جگہ نقصان و خسران سے تباہ ہو رہے ہیں۔ گاندھی جی جو خود حریت حقہ سے بے بہرہ ہیں۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ اس کی دعوی داری حریت مالویہ کی حکومت پرستی سے قطعاً شرمسار نہیں ہوتی وہ مالویہ کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتے ہیں اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، سری نواس آئنگر اور تمام دوسرے ہندوؤں کی یہی حالت ہے مگر مسلمانوں کا کوئی ابو الکلام کسی محمد علی سے ملنے کے لئے تیار نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ابوالکلام اور انصاری بھی تباہ حال ہیں اور ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہیں اور محمد علی، اقبال اور سر شفیع کی تمام مساعی بھی بے نتیجہ اور بے اثر ہیں کب کوئی اللہ کا بندہ ان درد انگیز حالات کی درستی کے لئے اٹھے گا"۔

اس عرصۂ ابتلاء میں برصغیر کے مسلمانوں پر کیا بیتی ؟ ہندو مسلم کشیدگی بلکہ خونریزیوں کے دروازے کھلے تو بظاہر یہ نمونۂ شکست تھا۔ مگر درحقیقت فتح مبین۔ اس کی کڑیاں مربوط رکھنے کے لئے حضرت علامہ کی وہ تقریر جو انہوں نے ایسے ہی ایک موقع پر شاہی مسجد میں ارشاد فرمائی بڑی اہم ہے۔ آپ نے آزمائش کے اس دور کے دو نتائج کو مبارک قرار دیا " ۱۔ خانہ خدا میں مل بیٹھنے کا موقع۔ ۲۔ مسلمانوں کے وہ فرقے جو آپس میں دست و گریبان رہتے تھے اس ابتلاء کے دوران میں ایک ہو گئے "، " تحفظ ناموس رسالت " کے موضوع پر ان دنوں ایک اور جگہ فرمایا " جو مسلمان عملاً توحید پر جمع نہ ہوئے وہ نبوت پر متفق ہو گئے " اور اس طرح وہ اتحاد پیدا ہو گیا۔ جس کی ضرورت عرصے سے محسوس ہو رہی تھی۔ غازی علم الدین شہید کی میت کا حصول ایک ایسی ایمان افروز جدوجہد تھی۔ جس نے پوری قوم کا زاویہ نگاہ بدل دیا۔ اس سے متاثر ہو کر علامہ مرحوم نے سوچا کہ " علم الدین شہید کمیٹی کے پرچم تلے جو کارکن اور اخبار نویس اکٹھے ہوئے ہیں ان کی قوتوں کو اس طرح بروئے کار لایا جائے کہ وہ ملکی سیاست میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ میں مددگار ہو سکیں۔ بالخصوص مسلمانان پنجاب کے حقوق کی حفاظت کے لئے۔ چنانچہ انہی کے مشورے سے کارکنوں کا ایک اجتماع منعقد ہوا۔ اور چھپن فیصد کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کا نصب العین یہ تھا کہ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی چھپن فیصد ہے۔ اس لئے انہیں تمام جمہوری اداروں میں چھپن فیصد نیابت دلائی جائے۔ اس تحریک نے فوراً عوامی رنگ لے لیا ہر طرف چھپن فیصد کا غلغلہ ہوا۔ علامہ اس میں براہ راست تو شریک نہیں تھے۔ لیکن پس پردہ رہنمائی کرتے رہے اس سلسلے میں عبداللہ ملک کی ایک کتاب " پنجاب کی سیاسی تحریکیں " نہایت اہم اور مفید ہے گو اس کے لہجہ تحریر سے سرد مہری جھلکتی ہے۔ مگر وہ مطلب کی بات لکھ گئے ہیں انہوں نے لکھا ہے " ۱۹ نومبر کے اخبار میں ملک لال دین قیصر کے نام اپیل کی گئی تھی اب اس کے دوسرے دن ہی انقلاب کی ایک خبر جو جلی حروف میں شائع کی گئی۔ اس کی سرخیاں یہ ہیں (۱) کانگرس کو مسلمانوں کا آخری الٹی میٹم (۲) لاہور میں حفاظت حقوق کی مہم شروع ہو گئی (۳) علم الدین کمیٹی کے مجاہدوں کا نیا میدان عمل (۴) چھپن فیصد کمیٹی اور کور کا قیام " ۱۹ نومبر کی شام کو عبدالمجید سالک کے زیر صدارت دفتر انقلاب میں جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں مسلمانوں کے جملہ حقوق کے لئے

خرباد پر آمادہ رہنے کا حلف اٹھایا گیا اور حفاظت حقوق کے لئے "چھپن فیصد کمیٹی" کی مجلس عاملہ تشکیل دی گئی جسکے ارکان درج ذیل تھے۔ سید عبدالقادر پروفیسر اسلامیہ کالج، ملک لال دین قیصر، شیخ غلام مصطفےٰ احیرت، ملک عبدالمجید ایڈیٹر مسلم آؤٹ لک، اختر علی خاں مدیر زمیندار، سید عنایت شاہ مالک سیاست، غلام رسول مہر، عبدالمجید قرشی، محمد الدین تاثیر پروفیسر اسلامیہ کالج، شمس الدین حسن ایڈیٹر خاور، میر عزیز الرحمان اور مسٹر امام علی نازش رضوی۔ اس جماعت کا دفتر کوچہ چابکسواراں میں قائم کیا گیا۔ شیخ غلام مصطفےٰ احیرت ان دنوں کوچہ چابکسواراں میں رہتے تھے اور ملک لال دین قیصر بھی قریب ہی کوچہ ککے زئیاں میں رہائش پذیر تھے۔ شیخ غلام مصطفےٰ احیرت کی یہ بیٹھک اس زمانے میں شعر و سیاحت سے دلچسپی رکھنے والے باغی قسم کے نوجوانوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ شیخ غلام مصطفےٰ احیرت مشن سکول کے سامنے مسجد فضل الٰہی کے نیچے سٹیشنری کی دوکان کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی یہ دکان ان نوجوانوں کا مرکز ہوتی اور شام کو اندرون کوچہ چابکسواراں میں ان کی بیٹھک میں یہ سب نوجوان جمع ہوتے تھے۔ اسی بیٹھک سے اپنے وقت کا مشہور ادبی ماہنامہ "فردوس" جاری ہوا تھا۔ اس سلسلے میں انکار کی تاب نہیں کہ چھپن فیصد حقوق کمیٹی کی سرگرمیاں چند روز کے اندر ہی سرد پڑ گئیں اور کارکن اس تحریک میں کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہ دے سکے لیکن یہ چند روز کی تحریک نئے دور کا پہلا باب ثابت ہوئی۔ اس کے فوراً بعد "مجلس احرار" کا قیام عمل میں آیا گو مجلس احرار نے الگ اسلامی ریاست کی تشکیل میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ البتہ آزادی ہند کے لئے ان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ ان کی پوری تاریخ انگریز دشمنی کا مستند ثبوت ہے۔ مجلس احرار کے قیام سے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ لیکن قید و صعوبت جھیلنے والے ان لیڈروں کی علیحدگی سے کانگریس کے رعب و داب اور ہندوؤں کے سیاسی بھرم کی کمر ضرور ٹوٹ گئی۔

راجپال ایجی ٹیشن کے دوران کوچہ چابکسواراں کے ایک شخص منشی احمد دین نامی نے ایک پمفلٹ "امان اللہ کو کافر کہنے والا خود کافر ہے" لکھا۔ اسے خلافت کمیٹی کے رضاکار میاں نیاز احمد اور میاں محمد الدین مختلف جگہوں پر چوری چھپے تقسیم کیا کرتے۔ غازی علم الدین کی شہادت کے بعد ان کی سرگرمیوں میں بڑی شدت آ گئی۔ پمفلٹ اور ایسے دیگر اشتہارات سے انگریز

کو بڑی پریشانیاں اٹھانا پڑیں یہ لٹریچر تقسیم کرنے والوں کی گرفتاری کے لئے خصوصی ٹیمیں مقرر کی گئیں۔ اس کے باوجود ان رضا کاروں نے ایک مدت تک حکومت کا ناک میں دم کئے رکھا۔

غازی علم الدین شہید کی شجاعت وجواں مردی کے بعد کوچہ جا بکسواراں میں علیٰحدگی پسند مشاہیر اور انگریز دشمن مجاہدوں کی ایک وافر تعداد پیدا ہوگئی۔ ان کی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح برطانوی حکومت کو ناکام اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ غازی علم الدین کی شہادت سے پورے برصغیر اور خصوصاً پنجاب اور لاہور میں افق سیاست پر جو اثرات مرتب ہوئے وہ انمٹ ہیں۔ پنجاب اور لاہور میں ایک قومی نظریہ رکھنے والی مسلمان پارٹیوں کو فروغ کیوں نہ ملا؟ اس کا جواب بھی فداکارِ رسالت کے واقعہ شہادت سے ملتا ہے جمعیت العلمائے ہند اور حسین احمد مدنی کے نظریہ قوم کو ملت اسلامیہ ہند نے قبول کیوں نہ کیا؟ مجلس احرار اور خاکسار ایسی مذہبی وسیاسی پارٹیوں کے نظریات کو ترویج نہ ملنے کے کیا اسباب ہیں؟ تاریخ میں ان سوالوں کا ایک ہی جواب ہے۔ اور وہ دوقومی نظریہ ہے دوقومی نظریے کا پختہ ایقان کس طرح ہوا؟ اس سلسلے میں ہمیں شہدائے رسالتؐ کا نام لینا پڑتا ہے۔ اگر ان واقعات کو تاریخ سے حذف کر دیا جائے تو دوقومی نظریے کے دوسرے تمام اسباب قاری کو مطمئن کرنے سے قاصر ہیں۔ غازی علم الدین کی شہادت سے خصوصاً لاہور کے نوجوانوں میں ایک نئے جذبے نے جنم لیا۔ کشمیر ایجی ٹیشن غالباً ۱۹۳۱ء میں ہوا۔ اس میں دیگر رضاکاروں کے علاوہ برادر شہید میاں محمد الدین کی گرفتاری بھی عمل میں آئی۔

راجپال ایجی ٹیشن اور غازی علم الدین کی شہادت سے یہ ثابت ہوگیا کہ ہندو مسلم کسی ایک ملک میں امن وامان سے نہیں رہ سکتے۔ حصول نعش کی تحریک سے سیاست کا پانسہ بالکل الٹ گیا۔ ذی اثر ارباب سیاست کا انداز فکر اسی دوران بدلا اور بہت سے مسلم اکابرین کانگریس اور دیگر جماعتوں کو خیرباد کہہ کر مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ ڈاکٹر اقبال کو دوقومی نظریے کا شدت سے احساس اسی وجہ سے ہوا۔ اس واقعہ سے جنم لینے والا علیٰحدگی کا جذبہ ہی ان کے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد کی روح ہے۔

شہدائے رسالتؐ کی جان فشانیوں کی اہمیت حضرت اقبال کے اس مکتوب سے بھی

اجاگر ہوتی ہے۔ جو انہوں نے محمد علی جناحؒ کو مورخہ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء بلعیغۂ اہم لکھا۔ آپ کا یہ خط نہایت طویل ہے۔ جس میں بین الاقوامی سیاست اور خصوصاً برصغیر کے حالات پر تبصرہ کیا گیا۔ مگر علامہ ممدوح قریب آغاز میں ہی لکھتے ہیں دو گزشتہ چند ماہ سے ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ سا قائم ہو چکا ہے۔ صرف شمال مغربی ہند میں ان تین ماہ میں کم از کم تین فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو چکے ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہین رسول کی کم از کم چار وارداتیں پیش آ چکی ہیں۔ توہین رسول کی ان چار وارداتوں میں ہر مجرم فی النار کر دیا گیا۔ سندھ میں قرآن کریم نذر آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے ہیں صورت حال کا تنفر غائر سے مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ ان حالات کے اسباب نہ مذہبی ہیں نہ معاشی بلکہ خالص سیاسی ہیں مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں بھی ہندو اور سکھوں کا مقصد مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری کر دینا ہے" ان شواہد کے باعث میں کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ حصول پاکستان کا اصل محرک شہدائے رسالت ہیں۔ کیونکہ مسلمانان ہند کے دلوں پر شدھی اور سنگھٹن کے داغ ابھی تازہ تھے۔ اس لئے مسلم لیگ پورے ملک میں ایک نمائندہ جماعت کی حیثیت سے ابھری۔ جس نے بالآخر قائداعظم کی بے لوث قیادت میں پاکستان حاصل کر لیا۔

○

برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں شہید علم الدین کی جانبازی سے اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس سے قطع نظر آپ کا نام ایک ہتھیار رہے۔ جس سے مسلمان اب بھی شاتمان رسولؐ کا شکار کرتے ہیں۔ جب کوئی غیر مسلم شان رسالت میں گستاخی کی جسارت کرنے لگتا ہے تو اسے پوری قوم علم الدین نظر آتی ہے اور موت اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتی ہے۔

آپ کے نام سے سیکڑوں ایسے مسئلے حل ہوئے۔ جن کی گتھیاں سلجھانے سے پوری قوم قاصر تھی۔ اب بھی کبھی کبھی متعصب غیر مسلموں کی ذہنیت جاگ اٹھتی ہے اور وہ نبی آخر الزماںؐ کی ذات اقدس کو ہدف تنقید بنانے لگتے ہیں۔ جاہل ہندو، انتہا پسند عیسائی اور سرمایہ دار یہودی گاہے بگاہے آپ کی پاک سیرت پر زبان درازی کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے گزشتہ چند برسوں کے دوران آپ کے جہاد کی اہمیت مزید اجاگر ہوئی ہے۔ ایک دفعہ برطانیہ میں نیشنل میوزیم کے ڈائریکٹر نے حضرت محمد مصطفےٰؐ کا مجسمہ نصب کرانا چاہا۔ پچھلے دنوں افریقہ میں حضرت خالدؓ بن

ولید پر بنائی جانے والی فلم کی نمائش کی گئی۔ یورپین ممالک کے بعض فلمسازوں نے رسول عربیؐ کی زندگی پر فلم بنائی اور اسے پردہ سکرین پر دکھانے کا انتظام کیا گیا۔ امریکہ میں ایک رسالے نے نبی پاکؐ کے متعلق کارٹون شائع کئے۔ لندن کے اخباروں نے بھی حضرت عائشہ صدیقہؓ اور محسن انسانیت کی پاک سیرت پر حرف گیری کا سلسلہ شروع کیا۔ توہین رسولؐ کے ان تمام واقعات پر مسلمان قوم اور خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں نے زبردست احتجاج کیا انہی دنوں ۹ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو امرتسر ٹیلی ویژن نے بھی نبی کریمؐ کی حیات طیبہ پر فلم دکھائی پاک و ہند کے مسلمان اپنے پیغمبرؐ کا تقدس لہولہو دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ گو مسلمانوں میں اسلاف کی سی حرارت دینی نہیں رہی۔ مگر رسول اللہؐ کی محبت ابھی ان کے دلوں میں باقی ہے جہاں کوئی حضور اکرمؐ کے خلاف منہ سے بے ادبانہ کلمہ نکالتا ہے۔ یہ بے تابانہ تڑپ اٹھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے عرب بھائیوں کو عیش پرستی اور بے پناہ دولت نے اس جذبے سے قریباً محروم کر رکھا ہے۔ لیکن پاکستان، ہندوستان، افغانستان، بنگلہ دیش اور بعض دیگر اسلامی ممالک کے مسلمان اس معاملے میں ابھی تک حساس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ توہین رسولؐ کے خلاف اس دوران سب سے شدید احتجاج برصغیر کے مسلمانوں نے کیا۔ اور ہر موقع پر غازی علم الدین شہید زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔ فلمسازوں نے حب رسولؐ کا یہ مظاہرہ دیکھا تو انہوں نے معافی مانگ لی۔ ایڈیٹروں کو جب پتہ چلا کہ مسلمان قوم کو علم الدین غازی کا کردار ابھی یاد ہے تو انہوں نے اخبارات میں معذرت شائع کرنے کا وطیرہ اپنایا۔ میوزیم ڈائریکٹر کو اپنی مذموم جسارت سے باز آنا پڑا۔ رسالوں نے برملا اظہار ندامت کیا۔ اور امرتسر ٹیلی ویژن کا ادارہ ہاتھ جوڑ کر معافی کا درخواست گار ہوا۔ ان بداعمالیوں کی تلافی صرف اس لئے ہوئی کہ غیر مسلم جانتے ہیں۔ اس قوم میں ابھی قاضی عبدالرشید موجود ہیں۔ علم الدین شہید کا درس عبرت انہیں تاحال یاد ہے۔ وقت آنے پر یہ شہید عبدالقیوم بھی بن سکتے ہیں۔ غازی محمد صدیق کی طرح صداقت کا اظہار کرنے کے لئے سینکڑوں افراد اب بھی بے قرار ہیں اور عبداللہ شہید کی یاد ان کے دلوں سے ابھی محو نہیں ہوئی وہ سمجھتے ہیں اگر ہم باز نہ آئے تو ہمارا انجام شردھانند، راجپال، نتھورام، پالامل اور چلچل سنگھ سے مختلف نہ ہوگا۔ یقیناً جب تک ہم اپنے ان شہیدوں کو یاد رکھیں گے کوئی ہمارے آقاؐ کی ناموس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا اور شہید علم الدین غازی کے نام سے انشاءاللہ تاقیامت گستاخان رسالت کا از خود خاتمہ ہوتا رہے گا۔

جفا سے وفا تک

- کس نے کیسا جرم کیا؟
- زخم ہوا دیتے ہیں۔
- ابھی کچھ لوگ باقی ہیں۔
- ایک گم گشتہ نابغہ روزگار۔

○

آپ کہتے ہیں کیا ہم کو غیروں نے تباہ
بندہ پرور یہ کہیں اپنوں کا ہی کام نہ ہو

ہماری فطرت بھی ایک عجیب نفسیاتی سانچے میں ڈھل چکی ہے۔ اور ذوق حد درجہ غیر اہم ہے۔ تخت و تاج کے وارثوں کی زندگی کا ایک ایک لمحہ حوالہ قلم کر دیتے ہیں اور سکونِ خلق کے قاتل بھی ہمیں یاد رہتے ہیں۔

غیر کی ستم پیشگی سے سینہ زخمی ہوتا ہے۔ مگر اپنوں کی جفائیں روح کو گھائل کر دیتی ہیں دوستی کے روپ میں ایک تعداد مدت سے رقص بسمل کی تماشائی ہے۔ تیر کھا کے جب کوئی کمین گاہ کی طرف دیکھتا ہے۔ تو اکثر اوقات اس کی اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ حرم کو اپنے مکینوں سے جس بات کا گلہ و شکوہ ہے۔ وفا کے پردے میں ہونے والی وہ جفائیں اگر کسی صنم کدے میں بیان کی جائیں تو ہائے ستم کی ایک جگر پاش چیخ سنائی دے اور بت بھی توبہ توبہ کہہ اٹھیں۔

گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہتے صنم بھی ہری ہری

غیر مسلموں نے بھی اسلام کو نقصان پہنچایا ہے مگر اس سے کہیں زیادہ خود مسلمان قصوروار ہیں گلہ جفائے وفا نما کا یہ ایک نہایت طویل باب ہے۔ میری سوچ و فکر کی نگاہیں اس وقت اس حکایت پر مرتکز ہیں۔ جب رسوائے زمانہ رسالہ "رنگیلا رسول" شائع ہوا۔ جس سے مسلمانوں کے کلیجے چھلنی ہو گئے۔ ابتدائی صفحات میں حوالوں کی رو سے نقل کر چکا ہوں کہ اس بدنام ترین کتاب کی نظر ثانی کا ارتکاب علامہ تاجور نجیب آبادی نے کیا۔ بعض محقق حضرات اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ یہ راجپال مکار کی ایک اور ترچھی چال تھی۔ ورنہ علامہ مذکور ایک بلند پایہ ادیب اور شہرت یافتہ سنجیدہ انسان تھے رہ رہ کر یہ خیال بھی آتا ہے۔ کہ ایمان سوزی کے تلخ و نازک مرحلے سے گزرتے وقت بحیثیت مسلمان اس کی پیشانی پر ضرور سلوٹیں ابھرتیں بہر صورت کچھ بھی ہو۔ راجپال نے ہماری داخلی کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ بقول راوی کے اگر علامہ نجیب آبادی نے اس جرم کا خواہ کسی ناگزیر مصلحت کے تحت ہی ارتکاب کیا ہو۔ اہل اسلام کے چہرے پر یہ بدنما داغ اور ایک انمٹ دھبہ ہے غازی علم الدین کی شہادت کے موقع پر ایس ایس پی سید نور حسین شاہ اور ڈپٹی کمشنر راجہ زمان مہدی خاں کا کردار بھی قابل نقد ہے۔ عام تاثر یہی ہے کہ گورنر کی طرف سے صرف بحالی امن کی ہدایات جاری ہوئیں تھیں۔ جب کہ ڈی سی کو امن عامہ کے طریق کار کا مکمل اختیار تھا۔ لیکن اعلیٰ ضلعی حکام تو ارباب حل و عقد کی خوشامد پر جا رہے تھے باوجودیکہ میانوالی کے رئیس خان محمد اکبر خاں اور دیگر مسلم معززین ہر قسم کی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لئے تیار تھے۔ نعش لاہور لانے پر پابندی لگا دی

گئی اور پولیس افسر سید نور حسین شاہ نے پر امن ہجوم پر پتھراؤ اور لاٹھیاں چلانے کا حکم دیا۔

ہماری فطرت بھی ایک عجیب نفسیاتی سانچے میں ڈھل چکی ہے اور ذوق حد درجہ غیر اہم ہے تخت و تاج کے وارثوں کی زندگی کا ایک ایک لمحہ حوالہ قلم کر دیتے ہیں اور سکون خلق کے قاتل بھی ہمیں یاد رہتے ہیں۔ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں ایسے درندہ صفت افراد کو تاریخ کے صفحات میں نمایاں جگہ ملتی ہے تفرقہ باز ملاؤں کے حالات سے سینکڑوں اوراق سیاہ کر دیتے ہیں قریب قریب ہر قابل ذکر ادیب کی سوانح حیات موجود ہے۔ شعراء کو ہم مافوق الفطرت مخلوق ظاہر کرتے ہیں۔ سیاست دانوں کی برسیاں منائی جاتی ہیں۔ مگر مجاہدوں کو بھلا بیٹھے ہیں ہمیں حقیقی محسنوں کے نام بھی یاد نہیں رہے مورخین اپنی ذمہ داری کا ثبوت دے سکے ہیں نہ اہل قلم نے خداداد صلاحیتوں کا صحیح استعمال کیا ہے ہم جفا پیشہ ہیں کبھی ہم نے یہ سوچا بھی نہیں کہ آزادی کے اصل محرکات کیا تھے یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے ان سے ہماری شناسائی نہیں جن کا لہو قوم کی زکوٰۃ ہے۔ بھلا وہ کون ہیں؛ جنھوں نے جام شہادت کے گھونٹ پی کر وطن و ملت کو زندگی بخشی۔

○

بعض لوگ سایہ دیوار ہوتے ہیں۔ ان کا معیار صبح و شام بدلتا ہے۔ ایسے لوگ کسی ملکوتی جوہر کے سزاوار نہیں ٹھہرتے۔ نہ وہ زمانے کو کبھی اپنے ساتھ چلا سکتے ہیں۔ ان کی وفاؤں کا محور زمانے کی رفتار ہے۔ غلام مصطفےٰ حیرتؔ "علم الدین کمیٹی" کے ایک سرگرم رکن تھے۔ اس سلسلے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ حصول نعش کی تحریک میں بھی انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن بہ عجلت دوسری جانب ڈھل گئے۔ حیرتؔ صاحب ڈیفنس کمیٹی کے ایک معروف رکن تھے اس لئے برادر شہید کو ان کے ساتھ خاصہ انس تھا۔ ایک موقع پر غلام مصطفےٰ حیرتؔ نے ان سے ضروری دستاویزات اور شہید کی تصویروں کا بلاک طلب کیا: تاکہ متعلقہ معلومات حسب وصیت اخبارات میں شائع کروائی جائیں اور مزید تصویریں بنوا کر لاکھوں عقیدت مندوں کو فراہم کی جاسکیں۔ موقف بظاہر نہایت پر خلوص تھا۔ اس لئے میاں محمد الدین نے بہ رضا و رغبت بعض اصل دستاویزات اور تصویریں اسے دے دیں۔ بعد ازاں اس کی نیت بدل گئی۔ ایک عرصے تک وہ آج کل کے وعدے کرتا رہا جو کبھی ایفا نہ ہوئے اور پھر حیرتؔ صاحب نے تصویروں کا وہ البم کسی ادارے کو دے دیا۔ جس نے جلب زر کے لئے

لاتعداد کاپیاں بنوائیں۔ اور لاکھوں روپے کمائے۔ علم الدین کمیٹی کا رجسٹر بھی حیرت میاں نے چھین رکھا تھا۔ حالانکہ اکابرین اس اقدام سے ناخوش اور بیزار تھے سنا ہے کہ وہ رجسٹر تاحال انہوں نے غصب کر رکھا ہے۔

غازی علم الدین شہید کی خوبی و کمال کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو خود اس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں سید جماعت علی شاہ علیہ الرحمۃ علی پوری آپ کے بڑے قدردان تھے انہوں نے مزار بنوانے کے لیے ایک خطیر رقم پیش کی اور مستری الٰہی بخش المعروف خادم گیارہویں شریف کو نگران مقرر کیا جس نے وہ عطیہ اپنی ضروریات زندگی پر صرف کر ڈالا۔ میاں محمد الدین دس پندرہ سال کی طویل مدت تک وقتاً فوقتاً اسے یاد دہانی کراتے رہے۔ لیکن کوئی مثبت حل برآمد نہ ہوا۔ بالآخر معززین کی مداخلت سے بامر مجبوری اسے مزار بنوانا پڑا۔

شہید کہلوانے کے حق دار وہی ہیں جو کل مقتل میں صداقت کے امین تھے اور غازی وہ ہیں جن کے دل میں آج بھی ایسی آرزوئیں چٹکیاں لیتی رہتی ہیں۔ مگر بعض لوگ موت کے تصور سے کانپ جاتے ہیں اور وہ انگلی کٹا کے شہیدوں میں اپنا نام کرتے ہیں۔

کیا شہید ناز بنے پھر رہے ہیں لوگ
مرنے کا شوق تھا تو سردار کیوں نہ تھے

شبلی بی کام ایک جانی پہچانی ادبی شخصیت ہے ایک زمانہ تھا۔ جب "وہ کوہستان" اخبار سے وابستہ تھے۔ شبلی صاحب نے ایک وقت میں غازی علم الدین کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے حاجی صدیق احمد کا انٹرویو قلمبند کیا۔ حاجی صدیق احمد نے بتایا "ہم مع دنیا پان فروش تاش کھیل رہے تھے کہ تکرار شروع ہوئی۔ تمام دوست بضد تھے۔ ایک کہتا تھا راجپال کو میں قتل کروں گا دوسرا مصر تھا کہ میں واصل فی النار کروں گا۔ آخر ہم نے قرعہ نکالا جو علم الدین کے نام نکلا اور اس کے لیے عزت کا باعث بن گیا۔ قتل کے وقت ہم بھی شہید مرحوم کے ساتھ ساتھ تھے"، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے میاں نیاز احمد حاجی کا بیان ہے کہ وقوعہ کے روز یہ افواہ بھی گرم تھی۔ کہ غازی علم الدین کا دوست حاجی صدیق احمد بھی قتل میں شریک ہے۔ جو بعد میں بالکل غلط ثابت ہوئی اور اس پر ایسا خوف طاری ہوا کہ اس نے غازی علم الدین سے ملاقات بھی نہ کی۔ چند برس وہ روپوش رہا اور پھر اپنے آبائی محلے میں واپس آگیا اس

کا ایمان اسقدر کمزور تھا کہ اس نے زندگی بھر کبھی غازی علم الدین شہید کا تذکرہ تک نہ کیا وہ ہر شخص کو سی آئی ڈی کا ملازم سمجھتا تھا۔ پاکستان معرض وجود میں آنے کے بعد بھی اس کی یہی کیفیت رہی چند سال ہوئے کہ وہ گمنامی کی موت مر گیا۔

فطرت کی ستم ظریفی ہے کہ جو لوگ انگریز کے خادم تھے ہمارے مخدوم بن بیٹھے جن کی وفاداریاں برطانوی حکومت سے استوار تھیں۔ جو معصیت پیشہ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہی تاج و تخت کے وارث بن گئے۔ جو انگریز کے اشارہ ابرو پر ہمارے مستقبل سے کھیلتے تھے۔ معرکہ خاک و خون کے فوراً بعد ہم پر مسلط ہو گئے۔ چرخ نیلی فام کی گردش انسان کو آغوش حیرت میں سلا دیتی ہے کہ گلستان کی تعزئین و آرائش میں جن کا خون شامل ہوتا ہے۔ بہار آنے پر وہ نظاروں سے محروم رہتے ہیں اور چمن کو اجاڑنے والے فصل بہار میں مزے لوٹتے نظر آتے ہیں۔ غازی علم الدین کی اسیری کے دنوں کا واقعہ ہے۔ ملک فیروز خان نون اس وقت وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا چہیتا ممبر تھا۔ میاں طالع مند اس کے پاس گئے اور اپنا تعارف کرایا۔ اس پر وہ بڑی سرعت رفتاری کے ساتھ جوتیاں پہنے بغیر آپ کو دفتر سے باہر لے آیا اور کہا دیکھیں کوئی دیکھنے نہ پائے اگر انگریز کو علم ہو گیا تو مجھ پر عتاب کی بجلیاں گریں گی۔ اس رویے سے شہید کے والد ماجد مایوس و ناکام لوٹ آئے

میاں محمد الدین شریف النفس اور سادہ لوح انسان تھے۔ روباہی صفت افراد نے شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے کوئی کسر چھوڑ نہ رکھی۔ فلم انڈسٹری والوں نے آپ کو ایک خط لکھا جو نیک جذبے اور اعلیٰ مقاصد کے تحت فلمانے کے اظہار پر مبنی تھا۔ اس کا نفس مضمون یہ ہے۔ "محبت بھرا اسلام قبول فرمایئے! آپ نے تین امور پر روشنی ڈالنے کے لئے فرمایا ہے! ہم غازی علم الدین شہید سے متعلق فلم اس لئے بنانا چاہتے ہیں کہ فلم سازوں کا رجحان اسلامی فلموں کی طرف منتقل ہو جائے۔ ننگی اچھل کود ختم ہو۔ اور معاشرے کو ایسے صحت مند خیالات دیئے جائیں جو قوم کی تعمیر و ترقی کا باعث ثابت ہوں (۲) یہ فلم جو ہم بنانا چاہتے ہیں یکسر اصلاحی ہو گی۔ ہم اس میں ثابت کریں گے وہ دل جو رسول پاک کی محبت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ دین و دنیا میں سربلندی حاصل کرتا ہے (۳) اس فلم میں کسی مذہب یا قوم کی تکذیب، و مذمت نہیں کی جائے گی۔ راجپال ایک فرد تھا اس نے سرکار دو عالم کی شان میں گستاخی کی خداوند کریم نے علم الدین کے دل میں ایسا جذبہ پیدا کر دیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید ہو گیا۔ ہماری

نئی پود اس قومی ہیرو کو فراموش کر چکی ہے۔ ہم محب رسول کی داستان حیات کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں سوائے اصلاح اور تعمیر کے ہمارے پیش نظر کوئی دوسرا جذبہ نہیں۔ ہم ان کی زندگی کے حالات نہایت موثر اور دلنشیں انداز میں پیش کریں گے۔ علم الدین کے خاندان کا وقار نوے کروڑ مسلمانوں کا خاندانی وقار ہے۔ علم الدین کے باعث یہ خاندان ہمارے لئے مشعل راہ ہے ہم نہایت دیانتداری کیساتھ علم الدین کی خاندانی شرافت، دیانتداری، غیرت، حمیت اور جملہ خوبیوں کا تذکرہ کریں گے۔ مجھے امید ہے آپ میری عرضداشت قبول فرماتے ہوئے ہمیں یہ کار خیر انجام دینے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے

۸ مارچ ۱۹۶۶ء۔

فلمساز میاں شفیق کی ہدایت پران کا ایک آدمی بابا عالم سیاہ پوش برادر شہید سے سادہ کاغذ پر اجازت نامے کے دستخط لے گیا۔ بعدازاں جب آپ کو علم ہوا کہ حقائق کو مسخ کیا جا رہا ہے اور زیب داستان کے لئے معاشقے کے کردار منسوب کئے جا رہے ہیں تو نیک دل احباب کے مشورے سے فلم انڈسٹری کو نوائے وقت اور مشرق اخبار کے ذریعے قانونی نوٹس دیئے گئے اس سلسلے میں ان کے وکیل لطیف ریحان صاحب تھے۔ مگر اسی دوران میاں محمد الدین بیمار پڑ گئے اور اس وقت فلم بھی پایہ تکمیل تک پہنچ چکی تھی۔ اس لئے خاص توجہ دی جا سکی نہ ان کی قانونی کارروائی موثر ثابت ہوئی اس طرح شہید رسالت کے کردار کو مسخ کر کے "غازی علم دین شہید" فلم بنا دی گئی اور معاشقے کے پارٹ دکھا کر قوم نے احسان چکا دیا۔

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

غم کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قوم غازی علم الدین شہید کو صحیح مقام نہیں دے سکی پاکستان میں ان کا جو احترام ہونا چاہیئے تھا۔ ہنوز نہیں ہے۔ ہندوستان میں اب بھی "راجپال ڈے" منایا جاتا ہے لیکن یہاں ایسے جذبے کی کوئی مثال نہیں۔ ۱۹۷۴ء کے آخر میں وزارت مذہبی امور اسلام آباد کیطرف سے اعلان کیا گیا۔ کہ غازی علم الدین شہید کے پرانے مزار کی جگہ اس کی عظمت کے شایان شان مزار تعمیر کیا جائے گا۔ عوام نے اس اعلان کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا۔ مگر یہ منصوبہ تاحال معرض التواء میں ہے اور ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

ایک شام محرر سطور نزد مزار قطب الدین ایبک پریشان خیال ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ میں نے

بعض ضعیف العمر حضرات سے پوچھ گچھ کی ۔ وہ جواب دینے کے بجائے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے ۔ میں بمشکل اس دکان پر پہنچا جہاں غازی علم الدین شہید نے نوک خنجر سے غیرت و حمیت کا باب رقم کیا وہاں دکان کے مالک جمیل صاحب سے ملاقات ہوئی تعارف کے مرحلے سے گزر کر اصل مسئلے کو چھیڑا اور نوک قلم سے صفحہ قرطاس پر لکیریں کھینچنے میں مصروف ہو گیا۔ اسی دوران جمیل صاحب قہقہہ لگاتے ہوئے گویا ہوئے کہ فلم انڈسٹری والے میرے پاس بھی آئے تھے ۔ انہوں نے کہا کہ چند روز کے لئے ہمیں دوکان مستعار دی جائے ۔ تاکہ بورڈ آویزاں کر کے اور کتابیں ترتیب دے کر پارٹ کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کریں ۔ میں نے ان سے کہا آپ میری دکان پر راجپال کا بورڈ لگانا چاہتے ہیں اور وقتی طور پر مجھے بھی راجپال تصور کر لیا جائے گا ۔ لہٰذا تصویر کشی کا مرحلہ طے کرنے کے لئے مجھے دس ہزار روپے معاوضہ دیا جائے ۔ اس لئے عدم معاہدہ کے باعث ساتھ والی دوکان پر عکس بندی کی گئی ۔ یہ سن کر میں حیران و ششدر رہ گیا ۔ کہ جلب زر کے لئے لوگ کیا کچھ کہلوانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور مصافحہ کئے بغیر یہاں سے چل پڑا ۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی شخصیت ادبی حلقوں میں کسی بھی تعارف کی محتاج نہیں وہ اقبال مرحوم کے ہم عصر ہیں اور ان کے قریبی دوست بھی ۔ ڈاکٹر چغتائی کے محاکمے اور دیگر فن پارے علم و دانش کا بیش بہا سرمایہ ہیں ان کی شخصیت کا قابل ذکر پہلو یہ ہے وہ غازی علم الدین شہید کی کتاب عشق کا ایک زندہ کردار ہیں ۔ اس لئے چغتائی صاحب کی شخصیت میرے لئے بڑی کشش رکھتی تھی مگر جب میں نے خط کے ذریعے ان سے رابطہ قائم کیا تو ان کی طرف سے ایک حوصلہ شکن جواب موصول ہوا جس کی عبارت درج ہے ،، آپ کا ارادہ نیک ہے ۔ مگر یہ تمام کارنامہ کوئی آسان کام نہیں ہے آج اس واقعہ کو سال ہا گزر چکے ہیں اور بہت طویل ہے ۔ آپ چونکہ ایک الگ قریہ میں رہتے ہیں اور آپ یہی وقت کسی اور کام میں گزار دیں تو بہتر ہو گا ۔ آپ کو میرے یہ الفاظ ضرور برے معلوم ہوں گے مگر ایسے الفاظ نصیحت کے طور پر بہت ہیں ۔

O

بیوفائی کے چند ان واقعات سے یہ مطلب ہرگز مترشح نہیں ہوتا ۔ کہ پوری داستان میں جفا کیشان کو فوقیت حاصل ہے ۔ اس میں ایسے مخلصان ملت اور روشن ضمیر افراد بھی شامل ہیں جن

کے بغیر یہ کہانی مکمل نہیں ہو سکتی۔ مولانا غلام مرشد صاحب بڑے عربی دان اور ایک بلند پایہ مفسر قرآن تھے۔ مجسٹریٹ کی عدالت میں آپ نے جو تقریر کی۔ وہ بڑی قدر و قیمت کی حامل ہے مقدمے سے بری ہونے کے بعد راجپال اور رنج کے خلاف سید عطاء اللہ شاہ کی شعلہ نوائی بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی تحریک سے حکومت کو تعزیرات ہند میں دفعہ ۲۹۵ الف کا اضافہ کرنا پڑا جس کی رو سے بانیان مذاہب کی توہین ایک جرم قرار پائی اور فرقہ وارانہ فسادات پھیلانے والا قابل گرفت تھا۔ علم الدین کمیٹی کے تمام رضاکار قابل تحسین و آفرین ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے مقدمے کے معارف میں ہاتھ بٹایا ان کا جذبہ ہمدردی بھی یاد رکھنے کے قابل ہے ڈاکٹر محمد اقبال نے "راجپال ایجی ٹیشن"، اور مقدمہ غازی علم الدین میں بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ علامہ ممدوح ان حضرات میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کی مساعی جمیلہ سے علم الدین شہید رح کی نعش مسلمانوں کے حوالے کی گئی۔ مسلمانوں کے انگریزی اخبار "مسلم آؤٹ لک" کے مالک وایڈیٹر کی ایمانی جرائت اور شجاعت و مردانگی بھی قابل ذکر ہے پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری نے آریہ سماجیوں کے خلاف وقتاً فوقتاً بڑا جہاد کیا۔

سیاست اخبار کے مالک سید عنایت اللہ شاہ زندہ دل مجاہد اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے اس سلسلے میں حکومت نے ان کے گھر کی ایک ایک چیز لوٹ لی اور انہیں متعدد مقدمات میں پھنسا دیا۔ گورنر نے ایک موقع پر شاہ صاحب سے کہا کہ وہ معافی مانگ لیں تو حکومت کا غصہ ان کی طرف سے فرو ہو جائے گا۔ مگر ان کی خود دار طبیعت نے تمام معائب بطیب خاطر جھیلنے اور ثابت کر دیا کہ یہ سر خدا کے سوا کسی اور کے سامنے نہیں جھک سکتا۔ اسی روزنامہ کے مدیر مولانا سید حبیب شاہ صاحب بھی ہمہ صفت موصوف تھے۔ رسول صلعم کی محبت و ارادت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی آپ کی جامع شخصیت ہر اسلامی تحریک کی روح ہوا کرتی۔ راجپال کے خلاف آپ نے جو تحریری و تقریری جہاد کیا۔ وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ انہوں نے راجپال کی ناپاک کتاب کے خلاف مسلمانوں کے پہلے جلسہ کی صدارت کی اور یہاں علم الدین شہید کی حصول نعش کے لئے مسلمانان لاہور نے جو پہلا جلسہ کیا۔ اس کا اعلان بھی کیا اور اس میں پہلی تقریر بھی کی۔ گورنر سے ملاقات کے لئے وفد مرتب کیا اور وائسرائے ہند کو متعدد تار ارسال کئے۔

راجپال کے قتل کے بعد غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک نے اپنے اخبار انقلاب میں جس کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انقلاب نے عدالتی کارروائی کا لمحہ لمحہ قلمبند کرنے کے علاوہ ہر موقع پر بلا جھجک قومی جذبات کا اظہار کیا۔ حصول نعش کے لئے اس ادارے کا قلمی جہاد اور عملی کوششیں بھلائی نہیں جاسکتیں۔ سر میاں محمد شفیع اور مولانا ظفر علی خان علم الدین کمیٹی کے رضاکار تھے حصول نعش کی تحریک میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ مولانا ظفر علی خان نے متعدد جلوسوں کی قیادت کی۔ اپنے اخبار "زمیندار" میں اس موضوع پر ان کا قلمی جہاد تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ ملک لال دین قیصر بھی علم الدین کمیٹی کے ایک فعال کارکن تھے۔ ان کی خدمات کبھی بھلائی نہیں جاسکتیں۔ میانوالی کے باشندوں نے غازی علم الدین اور ان کے لواحقین کے ساتھ بڑے اچھے برتاؤ کا مظاہرہ کیا۔ رئیس اعظم خان محمد اکبر خاں نے گھر کی چابیاں اور کھانے پکانے کا انتظام و انصرام بھی اپنے مہمانوں کو سونپ رکھا تھا۔ اس عرصے میں مہمانوں کو ضروریات زندگی کی ہر چیز میسر رہی خان صاحب نے جس آئین مہمان نوازی کی طرح ڈالی خاندانی میزبان بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں خان محمد اکبر خان مرحوم کے فرزند ارجمند خان محمد اصغر خان کا بیان ہے میری عمر اس وقت تیرہ چودہ سال تھی۔ میں نے اپنے والد ماجد کی معیت میں غازی موصوف سے ملاقات بھی کی۔ ہمارے گھر ان دنوں ہر روز سینکڑوں مہمان تشریف لاتے۔ جس روز مہمان زیادہ ہوتے والد مرحوم کو بہت زیادہ خوشی ہوتی اور وہ اللہ کا شکر بجا لاتے" یہی وجہ ہے شہادت سے قبل اور بعدازاں جب حصول میت کے لئے تحریک چلی۔ تو غازی صاحب کی والدہ ماجدہ ہر وقت میانوالی کی خیر ا میانوالی کی خیر اکی دعائیں مانگا کرتیں۔ آج بھی شہید موصوف کے لواحقین، باشندگان میانوالی، مضافات کے دیہاتیوں اور خصوصاً خان محمد اکبر خاں صاحب کی تعریف و توصیف فرمایا کرتے ہیں۔ کیوں نہیں خان موصوف نے جس خلوص و مروت سے شہید کے اقرباء اور مداحوں کو خوش آمدید کہا۔ اس کے اظہار کے لئے کسی مبالغے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو افسانے کو شرما سکتی ہے۔ اس لئے انہیں خراج تحسین نہ کرنا ایک اخلاقی جرم ہے اس خاطر میانوالی کے ایک معروف سماجی کارکن جناب کلیم اللہ ملک کے تاثرات کا سہارا لینا ناگزیر ہے ان کے نوک قلم سے قطرے ٹپکے تو ایک تصویر بن گئی۔ اس تصویر سے ذہن میں ایک گم گشتہ نابغہ روزگار کے

خدوخال ابھر آئے ضرورت ربط اور مخصوص انداز تحریر کے تحت مصنف نے مجبوراً قطع برید کا دامن پکڑا اور مصورانہ خامہ فرسائی کرنا پڑی۔ اس کے دیکھنے سے شاید قارئین کا قومی جذبہ بھی جاگ اٹھے حسن و خوبی کی پرستار نگاہیں ذرا یہ تصویر بھی دیکھیں! خان محمد اکبر خان قوم مسلم کی زبوں حالی پر خون کے آنسو ہی نہ بہاتے بلکہ اپنی استطاعت سے بڑھ کر مرفہ الحالی کے لئے عملاً سرگرداں رہتے۔ انہوں نے سلمانوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اور سرمائے کے علاوہ ہر طرح کی امداد دے کر بازار میں انہیں تجارت کرنے پر مجبور کیا جناب علم الدین غازی جب میانوالی جیل میں منتقل ہوئے تو ان کا دن رات کا چین اڑ گیا اور وہ عاشق مصطفےٰ کے میانوالی آتے ہی سرگرم عمل ہو گئے۔ جیل کے باہر آپ پوری تحریک کے سالار قافلہ تھے ان کے ساتھ کام کرنے والے بتاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ پروانہ رسولؐ کی محبت کے جنون میں دیوانہ ہو گئے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے ہر موقع پر ہندوؤں کی مذموم سازشوں کو سبوتاژ کیا۔

مرحوم محمد اکبر خان حریت فکر کے بہت بڑے علمبردار تھے انہوں نے ایک قومی نظریہ کے پرخچے اڑا کر دو قومی نظریے کو مسلمانوں کے ذہنوں میں جاگزیں کیا۔ میانوالی میں مسلم لیگ اور قیام پاکستان کے لئے جو کام آپ نے کیا۔ کوئی اور نا حال نہیں کر سکا۔ آپ حالانکہ ایک بہت بڑے زمیندار تھے۔ مگر غریب مسلمانوں کی ذرا سی تکلیف پر وہ تڑپ اٹھتے۔ ان کی پوری زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ جس میں اول تا آخر، ہمدردی، ایثار، غریب پروری، سوز دروں اور بہبود عامہ کے مصدقہ ابواب دعوت مطالعہ دیتے ہیں خان مرحوم رسول عربیؐ کے سچے عاشق اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے وہ بااصول اور خداترس مگر خوددار طبیعت کے مالک تھے جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ان کی فطرت تھی۔ خان محمد اکبر خانؒ ہمہ وقت زبان حال سے یوں بیان کرتے ہوئے سنائی دیتے۔

اے دل تجھے انجام کی کیا فکر پڑی ہے
ہم عشق کی دنیا میں سیاست نہیں کرتے
ہر ظلم کے منہ پر ہمیں سچ کہنے کی لت ہے
ہم لوگ تو ظالم کی بھی غیبت نہیں کرتے

خان محمد اکبر خان کے ساتھ کالا باغ کے نواب خاندان کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ مغربی پاکستان کے سابق گورنر نواب آف کالا باغ ملک محمد امیر خان مرحوم کے والد نواب عطا محمد

ملک ہر روز صبح کے وقت غازی علم الدین کے لئے فروٹ کی ایک ٹوکری بھیجا کرتے۔ انہیں غازی ممدوح سے بڑی عقیدت تھی وہ میانوالی جیل میں غازی صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے اکثر حاضر ہوا کرتے ایک موقع پر نواب عطا محمدؒ صاحب نے میاں طالع مند سے کہا اگر آپ اجازت دیں تو میں علم الدین کو جیل سے اغوا کروا دیتا ہوں" جب یہ بات برادر غازی کے ذریعے حضرت علامہ اقبال تک پہنچی۔ تو آپ نے فرمایا "ہم ایسا کبھی نہ کریں گے۔ اگر غازی علم الدین کو اغوا کر لیا گیا تو غیر مسلم ہمیں بزدلی کا طعنہ دیں گے وہ سمجھیں گے مسلمان حرمت رسولؐ پر مر مٹنے کی بجائے زندگی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں مطلب یہ اخذ ہوگا کہ علم الدین اپنے اس فعل پر پچھتانے لگا تھا۔ اور یہ ایک ایسا داغ ہے جو کبھی دھل نہ سکے گا۔"

بذات خود راقم الحروف کی ایسے سینکڑوں اشخاص سے ملاقات ہوئی۔ جو شہید رسالت کے دیوانے ہیں۔ آپ کا ذکر کرتے وقت ان کی آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں ان میں حاجی نیاز احمد صاحب بھی شمار ہوتے ہیں۔ آج بھی جناب رسالت مآبؐ کے فدائی کا ذکر کرتے وقت وہ آبدیدہ ہو جاتے ہیں اور پھر دھیرے دھیرے یہ حرف شکایت ان کی زبان پر آتا ہے کہ قوم آقائے مدنی کے سچے غلام کو صحیح مقام نہیں دے سکی۔ میاں صاحب قلم والوں کی جفاکشی پر بھی بڑا کڑھتے ہیں۔

شہر خموشاں

- تاریخی قبرستان پر ایک محققانہ نگاہ
- شہید رسالت ؐ کی آخری آرام گاہ
- یہ خطہ کس کس کا مدفن ہے؟
- لوح مزار پہ کیا لکھا ہے؟

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

جو شخص ہنگامہ پرور تھا۔ فضائے سیاست کی خاموشی
جس کو پسند نہ تھی۔ جس شورش سے شاہی محلوں
میں ایک شورش بپا رہتی تھی۔ آج وہ قبر کے ایک بوسیدہ
کونے میں از سرتا پا مجبور و نیاز ہے۔

اس جہاں رنگ و بو میں مہ وشوں کی کمی نہیں۔ حسینوں کے غمزہ و عشوہ و ادا کے فسانے سے کہیں آہوئے چشم فتانہ کی ہنگامہ پروری ہے۔ کسی کو صحرا کے سناٹے گیت محسوس ہوتے ہیں اور کوئی شہر کی رعنائیوں میں دلچسپی کا سامان ڈھونڈ رہا ہے۔ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے دلکش نظاروں کا سارا راز آئینہ دید میں مضمر ہے۔ جس حسن نظر ہوتا ہے جہاں آنکھ کھل جائے وہیں حسن کا گنج گرانمایہ نظر آجاتا ہے۔ جوہر کی خاک میں آمیزش اس کی جوہرانہ تاب پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ جانے کیوں میری نظر کسی دلکش نظارے میں نہیں ٹھہرتی۔ مگر میانی کا شہر خموشاں گویا مہ جبینوں کا مسکن ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نقش حیرت بن جاتا ہوں اور میری آنکھیں پہروں حسن و جمال کا نظارہ کرتی رہتی ہیں۔

حریم حسن میں ہوتی ہے آب و رنگ کی پوجا
بساط عشق پر پہلی کرن سجدے کو آتی ہے

یہ تاریخی قبرستان سمن آباد اور اسلامیہ پارک کے شمال، لٹن روڈ (غازی علم دین شہید روڈ) اور شارع مولانا روم کے مغرب، لیک روڈ کے جنوب اور چوبرجی و ملتان روڈ کے مشرق میں خاصے وسیع و عریض رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ پیر غلام دستگیر نامی نے کوئی دو مربع میل رقبے میں پھیلے ہوئے اس قبرستان پر محققانہ نگاہ ڈالی ہے۔ اس تاریخی گورستان کو عموماً میانی صاحب بولتے ہیں۔ جبکہ پورا نام میانی پنج ڈھیر ہے۔ چونکہ عالم یا امام کو پنجابی میں میاں کہتے ہیں اس لیے اس بستی کا نام میاں پڑ گیا۔ جو بعد میں بصورت غلط العوام میانی ہو گیا۔ بموجب "تحقیقات چشتی"، مغلیہ کے عظیم بادشاہ اکبر کے زمانے میں یہ جگہ علمائے کرام کے وعظ و تدریس کا تکیہ تھی۔ اس لئے یہ بستی میاں صاحب کے نام سے مشہور ہو گئی۔ مگر شاہ پرست طبقہ اور درباری علماء اکبر شاہ کی خوشامد میں اسے شاہ پور کہتے تھے۔

یہ شہر خموشاں جس میں ان گنت لعل و گوہر پوشیدہ ہیں اور لاکھوں پیکر حسن و ناز محو خواب ہیں۔ کسی زمانے میں ایک بہت بڑی پر رونق اور بابرکت بستی تھی۔ جس پر علم و عرفان کی بارشیں ہوا کرتیں یہ خطہ علماء حق کا مسکن تھا۔ جو یاد الٰہی میں مگن رہتے اور لوگوں کو دین حق کی تعلیم دیا کرتے پندرھویں صدی عیسوی میں یہاں کے نگران قطب العالم حضرت عبدالجلیل چوہڑ بندگی تھے۔ جو

سلوک کی منزلوں سے باخبر اور دریائے تصوف کے غواص تھے۔ آپ کی زندگی زہد و تقویٰ کی ایک کھلی کتاب اور شریعت کا عملی نمونہ تھی۔ طالبان حقیقت اکتساب فیض کے لئے دنیا کے گوشے گوشے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے شیخ ابوبکر (آپ کا مزار آگرہ کے محلہ جوگی پورہ میں ہے) جو قطب عالم حضرت عبدالجلیل جوہڑ بندگی کے حقیقی بھائی اور ایک معتمد مورخ ہیں وہ اپنی کتاب تذکرہ قطبیہ میں رقمطراز ہیں کہ جب سلطان السلاطین شہنشاہ ظہیر الدین بابر نے سرزمین ہند پر قدم رکھا تو فوج کے علاوہ علمائے کرام فقہا اور شب بیدار زہاد کی جماعت بھی اس کے ساتھ تھی۔ چنانچہ ان میں سید السادات سید علی غازی جو شیخ زین الدین غازی کے حقیقی بھائی اور اکابرین ولایت میں سے تھے۔ بھی ادھر تشریف لائے۔ سید علی غازی حضرت بندگیؒ کی زیارت کرنے اور ان سے فیض حاصل کرنے کی نیت سے لہانور (لاہور) پہنچے۔ اس زمانے میں قطب العالم وفات پا چکے تھے۔ اس لئے آپ نے ان کے مقبرے پر کئی روز مراقبہ کیا اور نیت کی کہ سلطان العاشقین حضرت بندگی قطب العالم عظمۃ اللہ تعالیٰ کے کسی طالب سے مل کر اشکال طریقت حل کریں۔ آخر ایک رات حضرت بندگیؒ کا آپ کو خواب میں ارشاد ہوا کہ میرے بھائی شیخ ابوبکر سے مل کر راہ طریقت حاصل کرو! یہی بات آپ نے ٹھیک اسی رات اور اسی وقت شیخ ابوبکر کو فرمائی اور حکم دیا کہ آپ فرزندم سید علی کو رموز طریقت اور اسرار حقیقت سے آگاہ کر دیں۔ شیخ ابوبکر کے الفاظ یوں ہیں "قطب العالم حضرت شیخ عبدالجلیلؒ کا مجھے باطنی ارشاد ہوا کہ سید علی غازی کو طریقت کے اشکال سمجھا دے اور اپنا محرم اسرار بنا لے اور آپ کا ہاتھ بھی میرے ہاتھ میں دے دیا"۔ فیضیاب ہونے کے بعد سید علی غازی نے واپس کابل، دہلی یا ترکستان جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور میانی صاحب کے ہو رہے یہیں اپنی جان جان آفریں کے حوالے کر کے آپ آسودہ خاک ہوئے۔

ع "دیکھے جو مئے خانہ مئے خوار ہوتا ہے"

"تحقیقات چشتی" میں مولوی نور احمد صاحب نے سید شاہسوار (سجادہ نشین حضرت طاہر بندگیؒ) کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک زمانے میں حافظ جان محمدؒ اس مکتب کے صدر معلم تھے۔ جن کے انتقال پر آپ کے فرزند ابو محمد قادری رئیس علماء مقرر ہوئے مگر بہت سے ملا

ان سے اختلاف کر کے رخصت ہو گئے اور صرف چند اشخاص ابو محمد صاحب کے متعلقین میں سے باقی رہ گئے۔ جس کی وجہ سے علم و عرفان کا یہ خطہ زوال پذیر ہو گیا اسی اثناء میں کھڈ شریف سے ایک خاندانی عالم دین حضرت میر علی نے یہاں قدم رنجہ فرمایا۔ ان دونوں کے اتفاق سے یہ موضع پھر آباد ہو گیا اور درس و تدریس کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا میر علی صاحب جب مستقل طور پر یہاں مقیم ہو گئے تو وہ کھڈ شریف سے اپنے پانچ بزرگوں کی نعشوں کے صندوق یہیں لے آئے اور انہیں میانی شریف میں دفن کر دیا۔ ان خانقاہوں کی وجہ سے میانی صاحب پنج ڈھیرا بھی کہلانے لگا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میانی میں پنج ڈھیریاں یعنی خمس قبور ہیں۔ مگر پیر غلام دستگیر نامیؔ اس وجہ تسمیہ سے مطمئن نہیں۔ کیونکہ پنجابی میں قبر کو ڈھیرا نہیں ڈھیری کہتے ہیں۔ سلسلہ تصوف کے ثقہ مورخ حضرت شیخ ابو بکر کی ایک کتاب "تذکرہ قطبیہ"، تقریباً ساڑھے چار سو سال سے ان کے خاندان میں متداول چلی آتی ہے اس کے حوالے سے نامی مذکور رقمطراز ہیں کہ ہماری خاندانی کتاب میں جو فارسی میں ہے اسے میانی پنج وہڑہ سا لکھا ہے وہڑہ پنجابی میں صحن کو کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ موضع اپنے پانچ صحنوں کی وجہ سے مشہور ہو اس سلسلے میں ان کی دو دلیلیں نہایت معقول اور وزنی ہیں۔ اول یہ کتاب "تذکرہ قطبیہ"، ظہیر الدین بابر کے انتقال سے کئی برس پہلے لکھی گئی۔ جس میں اس کا نام پنج وہڑہ لکھا ہے مزید یہ کہ پیر میر علی کھڈی کے بزرگوں کا مدفون ہونا تو کافی مدت بعد کا واقعہ ہے دوئم فارسی میں "ڈ" ہے نہ "ڑ"، اس لئے کتاب میں غلطی کا امکان بھی نہیں قصہ مختصر یہ نام پنجابی کے ڈیرہ یا ویڑہ سے منسوب ہے۔

تحقیقات چشتی میں مسطور ہے کہ ابو محمد بن جان محمد موصوف حضرت شیخ طاہر بندگیؒ کے فدائی اور راسخ العقیدہ مرید تھے۔ شیخ صاحب نقشبندی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فیض یافتہ تھے۔ حصار لاہور کے محلہ شیخ اسحاق میں ان کی رہائش تھی۔ جہاں اب حویلی جمعدار خوشحال سنگھ متصل چونا منڈی ہے۔ ہزاروں طالبان حق نے آپ سے اکتساب فیض کیا۔ مفتی غلام سرور لاہوری کی تحقیق کے مطابق آپ قریشی فاروقی ہیں آپ براہ سیستان لاہور آئے اس زمانے میں یہاں مغل شہنشاہ شاہجہاں کی حکومت تھی۔ حضرت شیخ طاہر بندگیؒ صاحب ۸ محرم الحرام ۱۰۴۰ھ بعمر ۵۶ سال واصل بحق ہو کر میانی میں دفن ہوئے۔ چونکہ ایک دفعہ شیخ صاحب نے فرمایا تھا

کہ جو کوئی میرے احاطہ مزار میں مدفون ہوگا۔ اس کے لیئے میں خدائے ایزد سے دعا کروں گا کہ وہ جنت میں جائے۔ اس لیئے لوگ ازراہ عقیدت میتوں کو یہاں دفن کرنے لگے۔ جب عہد محمد شاہ میں موضع میانی بالکل اجڑ گیا تو یہ جگہ عام قبرستان بن گئی۔ یعنی اس بستی کو عام قبرستان کی شکل اختیار کیئے دو سو سال ہو گئے ہیں۔ اور خواص کا تو یہ قریباً ساڑھے چار سو برس سے مدفن ہے۔

○

غازی علم الدین شہید (لٹن) روڈ پر واقع مزنگ چونگی کی جانب سے اگر اس شہر خموشاں میں داخل ہوں تو سنگ تراشوں کی تیشہ زنی غفلت کے پردے چاک کر دیتی ہے اور مادی دماغ سے دبیز پردوں کی تہیں ہوئے ہوئے ہٹنا شروع ہو جاتی ہیں اس سے آگے دو تین سیڑھیاں نظر آیئں گی۔ جن کے پاس ہی ایک مسجد خدائے ذوالجلال کی حمد و ثناء کر رہی ہے اس مرحلے سے گزرنے کے بعد ایک پختہ سڑک آجاتی ہے سڑک پر دایئں طرف ایک حجرہ نما مقبرہ ہے جو شیخ غلام معین الدین چشتی صابری کی آخری آرام گاہ ہے۔ چند قدم آگے اسی طرف ایک قبر موجود ہے جس پر جلی حروف میں لکھا ہے۔ "گمنام ورق" ایک بلند کردار انقلابی ایک قناعت پسند انسان "احسان الہٰی"، جس نے آزادی وطن کے لیئے غیر ملکی حکومت کے جیل خانوں میں اپنی نوجوانی ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۸ء کے سات سال گزار دیئے ایک غیور انسان جس نے گمنامی میں اپنے کردار کی عظمت کو ثابت کیا اور ۸ مارچ ۱۹۶۲ء بروز جمعرات کو اپنے ان انقلابی ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا جنہیں انگریز نے انقلابی جدوجہد کے جرم میں تختہ دار پر چڑھا دیا تھا۔

"زینت دار بنانا تو کوئی بات نہیں
نعرہ حق کی کوئی اور سزا دی جائے"

اسی روڈ پر بایئں جانب پر پیر بودیاں والی سرکار کا دربار عالیہ ہے۔ گنبد میں پیر جان امام بھی مدفون ہیں۔ اسی احاطے میں میراں پیر گیلانی صاحب راحت فرمایئں اور آس پاس عقیدت مندوں کی قبریں ہیں اس مزار کے بالمقابل سیدہ سعیدہ والدہ چن پیر ابدی نیند سو رہی ہیں۔ اس مزار میں مردوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اس خانقاہ سے ملحقہ پیر بودیاں والی سرکار کے خلیفہ مجاز مجنوں سایئں کا مزار ہے۔ اس خطہ سے باہر

نکل کر دوبارہ سڑک پر آجائیں تو چند قدم آگے لوہے کی ایک پلیٹ نظر آتی ہے۔ جس پر لکھا ہے کہ مرحوم شاعر ساغر صدیقی کے مزار کا پتہ اس شعر سے حاصل کریں۔

یہاں سے آگے جا کے اونچی جگہ کے پار
کوئی فاتحہ کہے ساغرؔ کے جا مزار

غازی علم الدین شہید کے مزار کے نزدیک ہی پنجابی کے نامور شاعر سراج دین مرحوم عرف استاد اللہ لوک کی قبر ہے۔ لوح مزار پر جن کی تاریخ وفات ۲۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کندہ ہے۔ اس سے تھوڑا سا آگے غازی علم الدین شہید کی مرقد منور ہے اہل عشق اس جگہ فکر سخن کو بھی کمالِ ادبی سمجھتے ہیں: یہ پلک بسیرا ہے یہاں نظریں سجدے کرتی ہیں۔ اس جگہ رشحات قلم کو تاب نہیں۔ اس تربت کا ایک ایک ذرہ قرآن حکیم کی زبان سے حیات جاوداں کی شہادت دے رہا ہے

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝

غازی علم الدین شہید کے مقبرہ کی تعمیر کے لئے حضرت سید پیر جماعت علی شاہ قبلہ علی پوری نے بصورت نقدی عطیہ پیش کیا۔ نقشہ مزار منشی واجد علی صاحب ڈرافٹسمین نے تیار کیا۔ شہید مرحوم کی قبر ۱۹۲۹ء میں تعمیر ہوگئی تھی جبکہ مزار چند سال بعد تعمیر ہوا۔ مقبرے کا پہلا مجاور نواب دین تھا اس کی رحلت کے بعد اب اس کی اولاد نگران ہے۔ غازی علم الدین شہید کے مزار پر انوار پر ایک شمع دان موجود ہے۔ جو ایک نومسلمہ خاتون حسن آرا بیگم عرف مسز بیگ نے بطور عطیہ پیش کیا۔ یہ نومسلمہ مستورا انجمن حمایت اسلام لاہور کے زنانہ یتیم خانہ کی مہتمہ تھی۔ لوح مزار بھی اس نیک عورت نے ہی بنوایا۔ اس پر کشمیری اور گجراتی لہجے میں قافیہ وردیف کی قید سے آزاد چند اشعار بھی کھدے ہیں۔ یہ موزوں اشعار بھی نو مسلمہ موصوفہ کی طبع آزمائی کا نتیجہ ہیں مذکورہ پارۂ نظم حاجی معراج دین اینڈ سنز کی دوکان سے کندہ کرایا گیا۔ غازی علم الدین شہید کی اصل تصویریں دو ہیں۔ ایک شالا مار باغ میں انہوں نے میلے کے دوران بنوائی اور دوسری گرفتاری سے چند دن پہلے کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ان گنت فرضی تصاویر بھی بنائی گئی ہیں۔ اس روایت کو ضبط تحریر میں لانا بھی بڑی دلچسپی کا مظہر ہے کہ لاہور میں غازی علم الدین شہید کا چہرہ انور صرف میاں طالع مند اور میاں محمد الدین کو دکھایا گیا۔

غیرت وحمیت کا یہ پیکر خطۂ میانی کے عظیم وعریض قبرستان میں میٹھی نیند سو رہا ہے۔ غازی علم الدین شہید کی قبر کا تعویذ سنگ مرمر کا ہے۔ شہید موصوف کے چاروں طرف آیت الکرسی اور اس کے مغرب و مشرق میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء کندہ ہیں۔ روضے کے اندر چاروں طرف ایک مسقف برآمدہ نما مسجد ہے۔ مگر روضہ بغیر چھت کے ہے احاطہ مزار میں آپ کے عزیز و اقارب کی قبور بھی ہیں۔ جن پر تاریخ وفات اور مرحوم کا شہید موصوف کے ساتھ تعلق مرقوم ہے۔ مزار کے دروازے کی پیشانی پر یہ الفاظ درج ہیں۔

"بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را"

سنگ بنیاد بدست مبارک الحاج حضرت پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری" دروازے کے ساتھ ہی مشرقی جانب ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے مزار کی شرقی دیوار میں پانچ جالیاں ہیں۔ جالی نمبر۱ کے متصل یہ شعر درج ہے۔

خواجہ بسے اجمیر میں اور غوث بسے بغداد
دونوں سانچے پیر ہو رکھیو ہمری لاج

جالی نمبر۲ کے متصل یہ مصرع لکھا ہوا ہے

"سینوں میں رہے جذبہ سدا عشق محمدؐ کا"

جالی نمبر۳ درمیان میں ہے اس کی دیوار کے اوپر یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ درج ہے۔ اس جالی کے بائیں طرف یہ عبارت درج ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُونَ

عشق میں جاں سے گزرتے ہیں گزرنے والے
مر کے زندہ ہیں رہ یار پہ مرنے والے

جالی نمبر۴ کے ساتھ یہ مصرع مندرج ہے۔

"قیامت تک رہے آباد ساقی تیرا میخانہ"

جالی نمبر۵ کے اوپر جلی حروف میں لکھا ہے "مزار منور غازی علم الدین شہید"

صلے میں ادارہ نوائے وقت سے ملا۔ اس کے لوح مزار پر ایسی عبارت کندہ ہے کہ انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

وہاں اب تک سنا ہے سونے والے چونک اٹھتے ہیں
صدا دیتے ہوئے جن راستوں سے ہم گزر آئے

ساغر صدیقی مر گیا۔ ایک شاعر مر گیا (ایک مخصوص فن مر گیا) ایک فقیر مر گیا۔ ایک انسان مر گیا۔ سب مر جاتے ہیں۔ مرنا سب کو ہے۔ لیکن کچھ زندہ رہ کر بھی مردوں میں ہوتے ہیں۔ کچھ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ ساغر بھی انہی میں سے ہے۔ اس لئے کہ اسے اپنے عہد کے معاشرے نے قتل کیا۔ اور معاشرہ ساغر کا قاتل ہے۔ روشنی سچائی اور نیکی کا قاتل اس لئے کہ ساغر روشنی، سچائی اور نیکی کا پیغامبر تھا۔

اگر ہم قبرستان کے وسط میں پہنچ جائیں یا چوبرجی کی طرف سے شہر خموشاں میں داخل ہوں۔ تو قصور روڈ پر قطب الاقطاب، اعلحضرت ابوالریاض حافظ محمد شفیق احمد پیر چہار سلسلہ کا آستانہ تجلیات ہے۔ سڑک کے بالکل ساتھ مرقد حمید نظامی مدیر ربانی "نوائے وقت" واقع ہے۔ جو ۱۹ رمضان المبارک ۲۵ فروری ۱۹۶۲ء کو انتقال فرما گئے تھے۔ جن کا عقیدہ و تعلیم جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا بہترین جہاد ہے اس سے چند قدم آگے ایک لوح مزار کے عقب پر "حسرت" کھدا ہوا نظر آئے گا۔ یہ مولانا چراغ حسن حسرت کاشمیری مرحوم کی آخری آرام گاہ ہے جن کی تاریخ وفات ۲۶ جون ۱۹۵۵ء ہے ایک ناقابل فراموش ادیب جس کی عمر گیسوئے اردو سنوارنے میں گزری آج اس کی حالت ناقابل رحم ہے۔ آخری مسکن کا ذرہ ذرہ سرتا پا گویا ماتم کناں کہانی سنا رہا ہے حسرت کتبے کے اوپر ایک عرصے سے کوڑے کرکٹ کی چادر پڑی ہے حسرت کے دیوانِ مزار سے واقعی حسرت ٹپک رہی ہے تختی پر حفیظ ہوشیارپوری کا یہ قطعہ کندہ ہے جس سے تاریخ وفات نکالی ہے۔

آج حسرت داغ حسرت دے کر رخصت ہو گیا
دل میں اب رہ کش رہے گا خوت حسرت کا داغ
بجھ گئی بزم صحافت میں صف ماتم حفیظ
گل ہوا ہے آج اک بزم صحافت کا چراغ!

اس سے متصل لعل حریت، مرد غیور، دلدادہ خوش صحافی، ادیب و شاعر ادب بے مثل خطیب

ے جو عاشق ہیں نہیں ڈرتے کسی سے کٹاتے ہیں سر بازار گردن

ع کوچہ عشق ہے یہ رہگذر عام نہیں

جالی نمبر ۴ اور ۵ کے درمیان دو شعر قابل مطالعہ ہیں ۔

ے بشر راز دلی کہہ کر ذلیل و خوار ہوتا ہے
نکل جاتی ہے جب خوشبو تو گل بیکار ہوتا ہے
مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

برہان شریف

مزار کا دروازہ جنوب کی طرف ہے ۔ اس دروازے کی مشرقی حصے کی دیوار میں چار جالیاں ہیں جن کے مندرجات یہ ہیں ۔ عاشق رسول غازی علم الدین شہید آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس سے گریز کرتے والو! کیا حضور کے نام پر شہید ہونے کی عزت کا نظارہ اس کے جنازے سے نہیں ہوا ۔ اگر دین و دنیا میں بھلائی چاہتے ہو تو محبوب خدا پر جان قربان کرو اور عاشقان مصطفیٰ کی چوکھٹ پکڑ و ۔ جو منکر ہے وہ کافر ہے ۔

اسلام کے جھنڈے کو جب غازی اٹھائیں گے
تکبیر کے نعروں سے دنیا کو ہلا دیں گے
اسلام زمانے میں دبنے کو نہیں آیا
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے
مسلم کو حقیقت میں کمزور نہ تم سمجھو
یہ مٹتے مٹاتے بھی دنیا کو مٹا دیں گے

ع رنگ میں ڈوبا ہے جو تیری محفل میں ہے

O

چوبرجی کی سمت ایک ویران حال لحد جس کے اوپر سبزہ خود رو اگا ہے ۔ یہ مرحوم ساغر صدیقی کا مدفن ہے ۔ جس کی تاریخ وفات ۱۸ جولائی ۷۴ء ۱۹ء ہے یہی وہ مجذوب حال شاعر ہے جس کے سرمایہ سخن کی سب سے بڑی قیمت دس روپے کا ایک نوٹ تھا جو اسے دو غزلوں کے

آغا شورش کاشمیری کا مدفن ہے۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء اور وفات کی تاریخ ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء ہے۔ جو شخص ہنگامہ پرور تھا۔ فضائے سیاست کی خاموشی جس کو پسند نہ تھی۔ جس شورش کی شورش سے شاہی محلوں میں ایک شورش بپا رہتی تھی۔ آج وہ قبر کے ایک بوسیدہ کونے میں ناز سراپا مجبور و نیاز ہے

اس سے نزدیک ہی شارع طاہر بندگیؒ صاحب واقع ہے۔ اس پر حضرت عارف کامل مولانا سید محی الدین قادریؒ سجادہ نشین ہشتم دربار قادریہ فاضلیہ بٹالہ شریف کا مزار ہے تھوڑا سا آگے قادری مسجد ہے۔ مہبط انوار، قطب جہاں، غوث زماں، فرد دوراں، شہباز لامکاں برہان شریعت، سلطان طریقت، فخر حقیقت، گنج معرفت حضرت محمد طاہر بندگیؒ چشتی صابری نقشبندی، مجددی محو خواب ہیں۔ یہاں سے طالبان حق کو روز و شب روح کی غذا فراہم ہوتی ہے۔ اس مزار کے شمال میں ایک گول سا چبوترہ ہے۔ جو پنج ڈھیرا کے نام سے موسوم ہے اسی مقام پر مولانا میر علی محدثیؒ نے اپنے پانچ بزرگوں کی نعشیں دفن کیں۔ حضرت طاہر بندگیؒ کے جنوب مشرق میں محلہ گل بیگم ہے۔ یہاں کا قطعہ زمین باغیچہ رانی گل بیگم کے نام سے معروف ہے۔ یہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زوجہ مہارانی گل بیگم کا مقبرہ ہے جو ۱۲۰۲ ہجری میں تعمیر ہوا۔ جبکہ رانی اس عمارت کی تکمیل کے دس برس بعد فوت ہوئی۔ غیر مسلم راجہ کی زوجہ مسلمانوں کی طرح مسلمانوں کے قبرستان میں کیوں دفن ہوئی؟ یہ قصہ قدرے دراز ہے جس پر تبصرہ کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔

باب طاہر کے راستے حضرت شیخ طاہر بندگیؒ کی مقدس بارگاہ میں حاضر ہونے سے پہلے ایک الیکٹرک پول سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اس کے پاس ہی مزدور شاعر احسان دانش کی لحد ہے جس کے متعلق ایک روسی مصنف نے اپنی کتاب میں لکھا وہ دنیا بھر میں واحد مزدور شاعر جو خدا کو مانتا ہے۔ اسے کسی معاشی نظام نے کچھ نہیں دیا۔ جو کچھ اس کے پاس ہے۔ یہ سب اس کی اپنی محنت کا پھل ہے... وہ آدمی جو صرف حرف شناس تھا۔ محنت نے اسے ایک ایسا بلند مقام عطا کیا۔ کہ استاد شاعر بھی اس کو اپنا استاد ماننے لگے۔ دانش بحیثیت انسان، ایک اچھا انسان تھا۔ مرتے مرتے زندہ اپنی تصانیف بطور عطیہ اردو بورڈ کے نام کر گئے۔ زندگی کی کٹھن راہیں کبھی اس کا عقیدہ متزلزل نہ کر سکیں۔ آنجہانی احسان دانش کی متجسس نگاہوں میں عشق رسولؐ کی جھلک بھی دکھائی دیا کرتی۔ جہان دانش کے مطالعے سے

افکار میں جو مدوجزر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کیفیت تورک بابری یا شہنشاہ جہانگیر کی خود نوشتہ سوانح عمری میں کہاں! دانش کدہ چھوڑنے سے چند دن پہلے مرحوم نے اپنے حال مطابق رسم کو گھائل کر دینے والا کتنا خوب صورت شعر کہا ہے۔

مجھے عادت ہے اپنے گھر نماز شام پڑھنے کی

میری میت کو دفنانا غروب شام سے پہلے

ہو الطاہر میں داخل ہو جائیں۔ تو دربار اقدس کو مڑتے وقت دائیں ہاتھ ایک کچی سی قبر نظر آتی ہے۔ پلیٹ پر مرقد والدہ شاعر مزدور احسان دانش ۱۹۵۶ء کے حروف تحریر ہیں نہیے نصیب مزدور بیٹے کی مزدور ماں نے بیگانے گھروں میں جھوٹے برتن مانجھتے ہوئے اپنے خدا سے دعائیں مانگ کر احسان کو دانش بنا دیا۔ اور پھر بوسیدہ حال چھپر کو دانش کدہ کا روپ عطا کیا۔ اب وہ محنت و مزدوری یہی اس کی عظمت کا راز ہے اس کے ساتھ ہی ایک اور لوح مزار اپنی طرف متوجہ کرتا ہے " مولانا نور محمد بٹالوی کی آرام گاہ، تحریک خلافت کے اور تحریک پاکستان کے ایک مخلص اور پر جوش مجاہد، جنہوں نے اپنی ساری زندگی اسلام کی سربلندی کی جدوجہد میں گزار دی اور سقوط ڈھاکہ کے صدمہ نے انہیں خالق حقیقی سے ملا دیا"

یہاں پردہ خاک میں ایسے مہ جبیں بھی پنہاں ہیں۔ جن کے چرچے سن کر لیلۂ شب نے اپنے زیور اتار پھینکے۔ درجنوں نامور شعراء اس جگہ مدفون ہیں۔ خدا جانے کتنے لعل و گہر اس خاک میں گم ہیں۔ اس بستی میں شاہ و گدا کا کوئی امتیاز نہیں۔ ہر ایک سر کے ساتھ فقط سنگ ہے جانے کتنے دانشوروں کی آ[illegible]ں کے نشاں بھی مٹ چکے ہیں۔ مولانا احمد علی لاہوری رح کی آخری آرام گاہ بھی یہیں ہے علم و ادب کے نایاب گوہر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کا تن خاکی بھی اسی خاک میں چھپا ہوا ہے۔ گریۂ صراحی پر کائنات کو لٹانے والا شاعر عبدالحمید عدم بھی اسی خطے میں اپنی نارسائی پر سینہ فگار ہے۔ جب میں آنجہانی عدم کی حسرت آیات قبر پہ فاتحہ خوانی کے لئے جانے لگا۔ تو جانے کیوں دل کے ایک گوشے سے ایسی صدا آئی جس نے ادھر جانے سے روک دیا۔ اتنے میں کہیں سے مجھے عدم کا یہ مصرع سنائی دیا۔ " ہر جگہ اس کی دھوم ہے جو ناموجود ہے" اور بات میری سمجھ میں آگئی۔